جلد ۶۶ | دسمبر ۱۹۶۶ء | عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

سالانہ چندہ ۷ روپے | قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ٦٦	دسمبر ۱۹٦٦ء	عدد ۴

چندہ سالانہ:	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ:
سات روپے	۵-اے، ذیلدار پارک - اچھرہ، لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ترجمان القرآن کے گذشتہ شمارے میں ہم نے یہ گزارش کی تھی کہ کسی شے، فرد، عقیدہ یا نصب العین سے وابستگی کا ایک ہی معیار ہے کہ انسان اُس کے لیے کتنا ایثار کر سکتا ہے اور اُس کے لیے کتنی قربانی دے سکتا ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اپنے خالق اور مالک کی بندگی، اُس کے رسول کی غلامی اور اس کے دین کی خدمت اور چاکری کوئی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ سخت کٹھن اور دُشوار منزل ہے۔ اس راہ میں انسان کو ہر طرح کے مصائب پیش آتے ہیں، اُسے ہر طرح کی قربانیاں دینا پڑتی ہیں اور اُسے ہر طرح کے شدائد سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ

(البقرہ - ۲۱۴)

پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے درآنحالیکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ انہیں تنگی اور سختی پیش آئی، اور انہیں ہلا ڈالا گیا۔ یہاں تک کہ پیغمبر اور جو لوگ اُن کے ہمراہ ایمان لائے تھے پکار اُٹھے کہ اللہ کی امداد (آخر) کب آئے گی؟ سُن رکھو اللہ کی امداد یقیناً قریب ہی ہے۔

مشہور مُفسّر امام فخرالدین رازی نے باساء اور ضراء میں جو لطیف فرق ہے اُسے بیان فرماتے ہوئے کہا ہے کہ پہلے میں راحت اور آسائش کے فقدان کا پہلو نمایاں ہے اور دوسرا درد و اذیت کو ظاہر کرتا ہے یعنی ایمان لانے کے بعد نہ صرف انسان کو اپنے آسائش و آرام سے محروم اور دستبردار ہونا پڑتا ہے

بلکہ اُسے اللہ کی راہ میں دکھ بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے مختلف مظاہر اور دائرے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا مظہر وہ قلبی کیفیت ہے جسے ایمان کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا دم بھرنے والوں کو خداوند عالم پر غیر متزلزل یقین اور ایمان ہونا چاہیے۔ اگر اُسے باری تعالیٰ کے وجود، اس کی صفات، اس کے ساتھ عہد و پیمان اور اس کے وعدوں پر یقین نہ ہوگا تو وہ محبت کے دعویٰ میں کبھی سچا اور مخلص نہیں مانا جاسکتا۔ جس ذات کے ساتھ گہری وابستگی کے آپ دعویدار ہیں سب سے پہلے اس پر بھروسہ ضروری ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔	بیشک مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر اس میں کبھی شک نہیں کیا اور اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا تو یہی لوگ راست باز ہیں۔ (الحجرات۔ ۱۵)

ایمان کی پہلی منزل اپنے قلب و دماغ کو ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک کرنا ہے۔ ریب و تشکیک ایمان کی ضد ہے۔ جس دل میں شکوک کی جھاڑ جھنکاڑ موجود ہو اُس میں کبھی بھی ایمان کی فصل نہیں اُگ سکتی۔ ایمان جو امن سے مشتق ہے اس کے اصل معنی ہی بقول امام راغب نفس کے مطمئن ہونے اور خوف کے دُور ہونے کے ہیں یا دوسرے لفظوں میں اس سے مراد وہ تصدیق ہے جس سے اطمینان حاصل ہو جائے اور کوئی تردّد باقی نہ رہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر یہود کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ (النساء۔ ۵۱)	کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور اُن کا حال یہ ہے کہ وہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں۔

یہاں یُومِنُونَ کا لفظ بطور طنز استعمال کیا گیا ہے اور ان کے فہم و فراست کی مذمت کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ گمراہ لوگ ایسی بیکار چیزوں سے اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کبھی بھی باعثِ اطمینان نہیں ہو سکتیں (امام راغب)

ایمان کامل یکسوئی، دل و دماغ کے مکمل اطمینان اور یقینِ محکم کا نام ہے۔ اور اگر کوئی شخص یہ کیفیت پیدا نہیں کر سکا تو وہ حلاوتِ ایمانی سے محروم ہے۔ ایمان کے معنی ہی یہی ہیں کہ انسان تمام اطراف سے نفع کی امید اور نقصان کا خوف ہٹا کر صرف اللہ، اس کے رسول اور اُس کے دین کے ساتھ وابستگی پیدا کرے۔ اُس کے نزدیک اللہ کی رضا، اُس کے رسول کی محبت اور اُس کے دین سے تعلقِ خاطر دنیا کے ہر دوسرے تعلق، دنیا کے ہر دوسرے رشتے پر فوقیت رکھتا ہو، بلکہ دنیا کا ہر دوسرا تعلق اس ایک تعلق پر بادنیٰ تامل قربان کیا جا سکتا ہو۔ اگر بھلائی کی تلاش ہو تو اُسے اللہ اور رسول کی محبت اور اُن کی سچی اطاعت گزاری اور اُس کے دین کی پیروی میں تلاش کیا جائے۔ اگر نقصان اور زیاں کا خوف لاحق ہو اور اس سے بچنے کی آرزو ہو تو یہ دیکھا جائے کہ اُس کے خالق و مالک نے کن چیزوں کو ضرر رساں قرار دیا ہے اور ان سے محفوظ رہنے کے لیے کیا تدابیر بتائی ہیں۔ اگر انسانوں کے ساتھ روابط قائم کرنا مقصود ہو تو اس معاملے میں بھی اللہ اور اُس کے رسول کے احکام کو ہی پیشِ نظر رکھا جائے۔ الغرض ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی پوری توجہ اور اُس کی ساری فکری اور جسمانی صلاحیتیں قطب نما سوئی کی طرح صرف ایک رُخ پر لگی رہیں۔ ہم روزمرہ زندگی میں جو لفظ اعتقاد بولتے ہیں تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ ساری اطراف کو جمع کر کے گرہ باندھ دی جائے۔ یعنی انسانی فکر و عمل کے سارے گوشے اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور اطاعت کے مرکز پر سمٹ کر رہ جائیں اور حیاتِ انسانی کا ہر گوشہ اور ہر شعبہ اس ایک مرکز سے مستنیر ہو۔ انسان کو اپنے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کے لیے اسی ایک مرکز سے سامان فراہم ہو، اسے اپنی معاشی فلاح، اُخروی نجات، معاشرتی عدل و انصاف، سیاسی استحکام اور اسی نوعیت کے دوسرے معاملات میں اسی سرچشمۂ ہدایت سے رہنمائی حاصل ہو اور اُس کے اندر کسی دوسری سمت نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی خواہش تک پیدا

نہ ہو۔ اسی حقیقت کی طرف حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم نے یوں اشارہ فرمایا ہے :

ذاق طعمَ الایمانِ مَنْ رضی
باللہ ربًّا وبالاسلامِ دینًا وبمحمدٍ
صلی اللہ علیہ وسلّم رسولاً - (مسلم)

اُس شخص نے فی الحقیقت ایمان کا مزہ چکھا جو خدا کی
خدائی پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ
وسلّم کی رسالت پر دل و جان سے مطمئن ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ، اس کے رسُول اور اُس کے دین سے محبت میں یکسوئی، ایک مثبت اور ایجابی کیفیت کا نام ہے جو منفی اور سلبی رجحانات کی نفی کرنے ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح معبودِ حقیقی کے ساتھ رشتۂ عبودیّت استوار کرنے کے لیے معبودانِ باطل کا ابطال ضروری ہے بالکل اسی طرح اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان ایمان کے تقاضوں کے مقابلے میں باقی سارے مفادات یکسر نظر انداز کر دے۔ ایمان اور عقیدہ خدا کے ساتھ کوئی نیم دلانہ اور عارضی وابستگی نہیں بلکہ یہ ایک نہایت مضبوط، گہرے، پائیدار اور ہمہ گیر تعلق کا نام ہے، جس کی چوکھٹ پر باقی سارے تعلقات کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ انسان جب تک اپنے قلب و دماغ سے جھوٹے خداؤں کی محبت پُوری طرح محو نہ کر لے، اس وقت تک خدائے واحد پر ایمان کی شمع نہیں جلائی جا سکتی۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے :

اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَ
اِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَ
اَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ
كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ
اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ
فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ
بِاَمْرِهٖ ۔ (توبہ - ۲۴)

اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی،
تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور وہ
دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے
مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے خدا اور اس کے
رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ
محبوب ہیں تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا
فیصلہ لے آئے۔

اِس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے مال و جان، برادری، اولاد، صنعت و تجارت، آرام و آسائش کو راہِ خدا پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے اور دنیا کا کوئی عزیز رشتہ اور قیمتی سے قیمتی متاع اُس کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

لَا یُؤمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ	کوئی تم میں سے مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس
اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَ	کے دل میں میری محبت اولاد، ماں باپ اور
النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ (صحیح مسلم۔ کتاب الایمان)	سب لوگوں کی محبت پر غالب نہ آجائے۔

ایک دوسرے مقام پر تھوڑے سے لفظی تغیّر کے ساتھ یوں فرمایا:

من کان اللہ ورسولہ احبّ	یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے تمام ماسوا
الیہ مما سواھما۔	کی محبتیں ہیچ ہو جائیں۔

ان آیات اور احادیثِ نبوی کو دیکھنے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک مومن کا سینہ عشقِ الٰہی اور عشقِ رسول سے کس طرح معمور ہوتا ہے۔ اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے اور ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حبِّ الٰہی ہے اور یہ وہ دولت ہے جو اہلِ ایمان کو نصیب ہوتی ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ	اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں
اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ وَ	کو اس کا ہمسر بناتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔	رکھتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ سے رکھنی چاہیے حالانکہ
(البقرہ۔ ۱۶۵)	اہلِ ایمان تو اللہ کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں

ایمان کے بعد اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے دُوری ہے۔ چنانچہ جو لوگ کہ راہِ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے اُن کو پکار کر سنا دیا گیا:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ	مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دینِ اسلام سے

مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ ۔ (مائدہ ۔ ۵۴)

پھر جائے گا تو خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں، وہ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کریگا جنہیں وہ محبوب رکھے گا اور وہ اس کو محبوب رکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کوئی بے حس کیفیت نہیں جس سے انسان کے قلب و دماغ میں کوئی تلاطم نہ پیدا ہوتا ہو۔ محبت ایک نہایت ہی حساس اور انقلاب انگیز کیفیت ہے جو ایک طرف انسانی جذبات کی اتھاہ گہرائیوں کو شدید طور پر متاثر کرتی ہے اور دوسری طرف اُس کے فکر و عمل میں غیر معمولی نمایاں تبدیلیاں پیدا کرتی ہے۔ وہ محبت جو قلب میں سوز، اللہ کی راہ میں اطاعت اور جاں نثاری کا جذبۂ صادق، احکامِ الٰہی کی پابندی کے لیے جوش اور ولولہ اللہ کے دین کو دوسرے ادیان پر غالب کرنے کا حوصلہ اور اس جد و جہد میں مصائب اور تکلیفات اٹھانے کا عزم پیدا نہیں کرتی وہ محبت نہیں بلکہ بے مروتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کے دل میں محبتِ الٰہی کی شمع روشن ہو مگر وہ ایمان کی حرارت اور سوزِ یقین سے خالی رہے اور اُس کی زندگی کے سارے گوشے اس نورِ ایمانی سے تابندہ اور درخشاں نہ ہونے پائیں۔ اللہ سے محبت کرنے والے کی دلی کیفیات کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ

(المائدہ ۔ ۸۳ ۔ ۸۴)

جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں بہنے لگتی ہیں۔ وہ بول اٹھتے ہیں کہ پروردگار! ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے، اور وہ کہتے ہیں اکہ کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے اُسے کیوں نہ مان لیں۔

یہ آیات حق اپند اور حق پرست لوگوں کی دلی کیفیات کی پوری طرح ترجمان ہیں - اللہ سے محبت کرنے والے اُس کے پیغام کو بے توجہی سے نہیں سنتے بلکہ اسے ارشادِ ربانی سمجھتے ہوئے اس کی پوری عظمت کو قلب و دماغ میں رکھتے ہوئے قبول کرتے ہیں - پھر یہ پیغام اُن کے دل کے کسی گوشے میں ایک بھولی بسری داستان کی حیثیت سے نہیں پڑا رہتا بلکہ وہ انہیں شدید طور پر متاثر کرتا ہے - اس سے اُن کے دل کی دنیا زیر و زبر ہوتی ہے - ان کے اندر اپنے مرتبہ و مقام کو جاننے، اپنے خالق و مالک کو پہچاننے اور اپنے نامۂ اعمال پر غور کرنے کی زبردست تحریک پیدا ہوتی ہے - اور وہ حق کا اسی گرمجوشی اور محبت سے استقبال کرتے ہیں جس طرح ایک ماں اپنے گم شدہ بچے کی مدتِ دراز تک جدائی برداشت کرنے کے بعد خیر مقدم کرتی ہے - ایک مومن و مسلم احکامِ الٰہی کو بار سمجھ کر قبول نہیں کرتا بلکہ بڑی خوشدلی اور گرمجوشی کے ساتھ انہیں قبول کرتا ہے - اُن کے بجالانے میں اُسے بڑی راحت ملتی ہے اور وہ اسے اپنی غیر معمولی سعادت خیال کرتا ہے - یہی وجہ ہے کہ باری تعالیٰ نے اپنی محبت کا ایک ہی معیار ٹھیرایا ہے کہ اس کے رسول کی پیروی کی جائے :

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳۱)	اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو محبوب رکھے گا۔

محبتِ الٰہی کے دعووں کی جانچ کے لیے کتنا اچھا معیار بنا دیا - یعنی اتباعِ رسول - جو جتنا زیادہ متبع رسول ہوگا اُسی قدر اُس کی محبتِ الٰہی مسلّم و معتبر ہو گی۔

پھر اس کے ساتھ باری تعالیٰ نے اِس حقیقت کی بھی وضاحت فرما دی ہے کہ رسول کی اطاعت خوشدلی اور محبت کے ساتھ ہو اور اُس کے احکام کی بجا آوری میں انسان کو طمانیتِ قلب حاصل ہو اور یہ کسی طرح بھی اس کے لیے بار خاطر نہ ہو۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ	آپ کے رب کی قسم! یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو فیصلہ کُن نہ مان لیں - پھر آپ جو فیصلہ کریں اس پر

يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْماً ۔ (النساء - ۶۵) اپنے دل میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ خوشدلی سے تسلیم کریں۔

آیت نے اس حقیقت کو صاف کر دیا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف زندگی کے مختلف مسائل کے بارے میں محض رجوع ایمان کے لیے کافی نہیں ہے عقلی اور اعتقادی حیثیت سے بھی اطمینان رسولؐ خدا کے فیصلوں پر ہونا چاہیے۔ حضورؐ کے ہر فیصلے کو پوری خوشدلی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔

سورۃ الحجرات میں باری تعالیٰ بارگاہِ رسالت کے آداب بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ

مسلمانو! تم اپنی آوازیں رسولِ خدا کی آواز سے اونچی نہ کرو۔

حافظ ابنِ قیم نے اعلام الموقعین میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر حضورؐ کی آواز سے زیادہ اونچی آواز نکالنا اعمال کے ضائع ہونے کا باعث بن سکتا ہے تو کیا حضورؐ کی آرا، حضورؐ کے فہم و فراست، حضورؐ کے ذوق پر اپنی رائے، اپنے فہم اور اپنے ذوق کو مقدم رکھنا اعمال کو ضائع نہیں کر سکتا۔ جو شخص ایمان کا دعویدار ہے اور اللہ اور اُس کے رسولؐ کی محبت کا دم بھرتا ہے اُس کے دعوے کی صداقت کا سارا دار و مدار اسی بات پر ہے کہ وہ احکامِ الٰہی اور احکامِ رسولؐ کی سچے دل کے ساتھ پیروی کرے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب - ۳۶)

اور کسی مومن یا مومنہ کے لیے یہ درست نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا حکم دیں تو پھر اُن کو اپنے (اس) امر میں کوئی اختیار باقی رہ جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول نے زندگی کے جن معاملات کے متعلق اپنے احکام صادر فرما دیئے ہیں اُن میں اہلِ ایمان کوئی من مانی کارروائی نہیں کر سکتے۔ ان سب معاملات میں انہیں احکامِ الٰہی اور ارشاداتِ رسول کی پیروی کرنی چاہیے اور یہی طرزِ عمل اختیار کرنے سے وہ مومن

مسلم کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

دنیا میں شاید ہی کوئی فرد ایسا ہو گا یا کوئی قوم ایسی ہو گی جس نے اسلام کے کسی اصول کو نہ اپنایا ہو یا جس کی زندگی کے تمام گوشے اسلامی تعلیمات سے یکسر خالی ہوں۔ تعلیماتِ ربانی اتنی فطری اتنی ہمہ گیر اور اتنی حیات آفریں ہیں کہ ان کے اکثر و بیشتر حصّوں کو اپنائے بغیر کسی صحت مند انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ افراد یا قومیں جو نہ صرف اسلام کی دشمن ہیں بلکہ سرے سے مذہب ہی کی مخالف ہیں اور اسے مٹانا اپنی زندگی کا مقصد قرار دیتی ہیں وہ بھی اسلام کے بہت سے اصولوں کو اپنانے پر مجبور رہیں۔ معلوم ہوا کفر بھی اپنی بقا، توسیع و ترقی کے لیے اسلام کے بعض اصول و ضوابط کا محتاج ہے۔ اس وقت روس سے زیادہ مذہبی بیزاری پر کس ملک کو ناز ہے لیکن وہاں بھی دیکھیے کہ ماں کی عزت و آبرو کی حفاظت، بہن کی عفت کا تحفظ، ماں باپ کا احترام، پڑوسی کے حقوق کا خیال، غریبوں اور بیکسوں کی معاونت و دستگیری، سماج کے کمزور طبقوں کو سہارا دینے کی آرزو، یہ سب وہ احساسات و جذبات ہیں جن کا سرچشمہ مادیت نہیں بلکہ مذہب ہے۔ ماں باپ اگر ضعیف اور کمزور ہیں اور وہ قومی آمدنی میں اضافہ کی بجائے اس پر بار ہیں تو خالص مادی نقطۂ نظر سے وہ وطن اور قوم کے دشمن ہیں۔ وہ کسی رعایت اور ہمدردی کے مستحق نہیں۔ انہیں جتنی جلدی ختم کر کے ان کے خون، ہڈیوں اور گوشت کو کام میں لایا جائے اتنا ہی معاشی اعتبار سے مفید اور کارآمد ہے۔ لیکن دنیا کی کوئی قوم بھی یہ خالص معاشی تصوّرِ حیات اپنانے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ انسان کے اندر کچھ لطیف احساسات بھی پائے جاتے ہیں جنہیں وہ کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان مقدس احساسات سے ہی اُس کی انسانیت کا بھرم قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کے باغی افراد اور مذہب کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا عزم رکھنے والی قومیں آج تک مذہب سے پوری طرح پیچھا نہیں چھڑا سکیں۔ مذہب اور اُس کی تعلیمات اُس کے تحت الشعور اور لاشعور میں ضرور موجود ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام انسان کی فطرت میں داخل ہے تو پھر ایک

مومن اور کافر ہیں یا ایک مسلم اور غیر مسلم قوم کے درمیان کیونکر تفریق کی جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلم فرد یا مسلم قوم اللہ کے دین کو پورے اخلاص اور یکسوئی کے ساتھ اپنانے کے لیے کوشش کرتی ہے۔ یہ دین ہی اس کی زندگی کا مدار اعلیٰ اور جوہر حیات ہوتا ہے۔ اس دین سے ہٹ کر یا اس کے کسی پہلو کو نظر انداز کر کے وہ کسی دنیوی اور اخروی بھلائی کا تصور نہیں کر سکتی۔ اسی دین کی پیروی کو وہ اپنی فلاح و کامرانی کا واحد ذریعہ سمجھتی ہے۔ اس قوم کے افراد کو ذہنی سکون، قلبی اطمینان اسی دین میں میسر آتا ہے۔ وہ اپنے مسائل کا حل اسی دین میں تلاش کرتی ہے۔ الغرض انفرادی زندگی کی معمولی سے معمولی الجھنوں سے لیکر اجتماعی زندگی کے پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات تک میں دین ہی اس قوم کا اور اس کے ہر فرد کا رہنما ہوتا ہے۔ دین اس قوم کے قلب و دماغ میں، اس کے فہم و احساس میں، اور اس کی زندگی کے ہر گوشے میں پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ وہ فرد یا قوم اسی دین کی خاطر جیتی ہے اور اسی کی سربلندی کے لیے مرتی ہے۔ اسی حقیقت کو باری تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (الانعام-۱۶۳)	آپ کہہ دیجیے کہ میری نماز اور میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور مرنا سب کچھ اللہ رب العلمین کے لیے ہے۔

باری تعالیٰ کے ساتھ اس اطاعت شعاری کے مسلک کو چھوڑ کر جو لوگ اسلام کے بعض اصولوں اور ضابطوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنانے کے لیے مجبور ہوتے ہیں، ان کے طرز عمل کو کسی اعتبار سے بھی مخلصانہ اور خدا پرستانہ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی اصل غایت خدا کی رضا اور مالک الملک کی خوشنودی اور اس کے فیصلوں پر تسلیم و رضا نہیں ہوتی۔ وہ اپنے سامنے کچھ دوسرے مقاصد اور دوسرے عزائم رکھتے ہیں۔ البتہ ان مقاصد اور عزائم کی تکمیل میں اگر کچھ دینی اصول اور ضابطے مفید اور کارآمد ہوں تو وہ ان سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ دین کو اپنانا یا احکام الٰہی کی پابندی کرنا یا ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کو خوشدلی اور ذوق و شوق سے، قصد و ارادے کے ساتھ اختیار کرنا ان کے پیش نظر

نہیں ہوتا۔ جس طرح مسافرت میں ہم بسا اوقات اُن راستوں پر بھی گزرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو ہماری منزل مقصود کو نہیں بلکہ دوسری منزلوں کی طرف جاتے ہیں بالکل اسی طرح زندگی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، کی گزرگاہوں سے گزرتے ہوئے ہمارے قدم چند لمحوں کے لیے ایسے راستوں پر پڑ جاتے ہیں جو ہمیں اپنے نصب العین کی طرف لے جانے والے نہیں بلکہ دوسری سمتوں کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں۔ جو شخص جتنا کسی نصب العین کے حصول کے لیے بیتاب ہوگا اسی نسبت سے وہ زندگی کے ان چوراہوں سے زیادہ محتاط اور چوکس ہو کر گزرے گا کیونکہ یہی وہ اہم اور نازک مقامات ہیں جو اُسے تھوڑی سی بے احتیاطی اور غفلت کی وجہ سے غلط راستے پر ڈال کر اصل منزل سے بہت دُور لے جا سکتے ہیں۔ کسی نصب العین کے عشق میں سرشار افراد اور قومیں ایک لمحہ بھی کسی غلط راہ پر چلنا گوارا نہیں کرتیں۔

کسی نصب العین کے اثرات کسی فرد یا قوم میں اُسی وقت نمایاں ہوتے ہیں جب وہ اُسے پوری یکسوئی کے ساتھ اپنائے۔ اگر کوئی فرد یا گروہ نصب العین کے ساتھ پوری طرح وابستگی پیدا نہیں کرتا تو وہ اُس کے ثمرات سے کیونکر بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے مسلم قوم کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ اس قوم کے رہنما اور اس کے افراد اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام اُن کا منتہائے مقصود ہے۔ لیکن ان لوگوں کے سوچنے کے انداز، ان کے خوب و ناخوب کے پیمانے، ان کا تصورِ فلاح، ان کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی افکار اور ان کی عملی سرگرمیوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی نظر نہیں آتی جس کے متعلق وثوق سے کہا جا سکے کہ انہوں نے قصداً اور ارادہ کے ساتھ دوسرے راستوں کو چھوڑ کر اسلام کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس قوم کے اربابِ اختیار اور اہلِ علم کی باتیں سننے سے یُوں محسوس ہوتا ہے کہ اسلام ان کے نزدیک ایک دلکش نعرے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا جس سے وہ بوقتِ ضرورت عوام کے جذبات بھڑکا سکتے ہیں۔

اسلام سے وابستگی کا سب سے پہلا ثبوت یہ ہے کہ اُمتِ مُسلمہ کو اس کے عوام اور خواص کو، اس کے

اہلِ علم اور اہلِ دانش کو، اس کے سیاست دانوں اور ماہرینِ معیشت کو، اور اس کے اربابِ اقتدار کو اس دین پر پورا پورا اعتماد ہو اور وہ اپنے دل میں اس امر کا یقین رکھتے ہوں کہ اُن کی اور اُن کی قوم کی بہتری کا راز صرف اس دینِ حق کو اپنانے میں مضمر ہے۔ لیکن یہاں ہمیں اسلام پر اعتماد کی جگہ اس کے متعلق بے یقینی، اس کے مستقبل کے بارے میں مختلف قسم کے شکوک اسکی تعلیمات کے متعلق کئی قسم کے شبہات نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملت کے اربابِ اختیار اسلام کے ساتھ کچھ دوسرے افکار و نظریات، فلاح و بہبود کے کچھ دوسرے تصورات اور باطل نظامہائے حیات کے کچھ مادہ پرستانہ اصول لے کر دنیا کے سامنے بطور نصب العین پیش کرتے ہیں۔ باری تعالیٰ نے تو ہمیں یہ خوشخبری دی ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ یعنی دین ہمارے لیے ہر لحاظ سے مکمل ہو گیا ہے اور باری تعالیٰ کو احکام کی صورت میں اور ضابطۂ حیات کی شکل میں ہمیں جو ہدایات دینی تھی وہ ہمیں نبی آخر الزمان کی وساطت سے مل چکی ہیں۔ اب اس میں کسی ترمیم و اضافے کی گنجائش باقی نہیں رہی لیکن ہم اسلام میں سوشلزم کے پیوند لگا کر یہ ثابت کر رہے ہیں کہ یہ دین ناقص اور نامکمل ہے اور اس کی تکمیل غیر اسلامی عناصر شامل کرنے سے ہو سکتی ہے۔

باری تعالیٰ نے تو ہمیں واضح طور پر یہ بتا دیا ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ یعنی اس کی نظر میں بجز اسلام کے کوئی دوسرا ضابطۂ حیات، کوئی دوسرا نظریۂ زندگی، کوئی دوسرا اسلوبِ زیست، انفرادی اصلاح یا اجتماعی نظم کا کوئی دوسرا لائحہ عمل مقبول نہیں۔ لیکن ہم زبان و عمل سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ تنہا اسلام ہمیں منظور نہیں۔ اس کے ساتھ ہمیں کچھ دوسرے ضابطے، کچھ دوسرے اصول بھی درکار ہیں جن کی مدد سے ہم فلاح و کامرانی حاصل کر سکتے ہیں۔

ایمان اور غیر متزلزل اعتماد دونوں لازم و ملزوم ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اعتماد ایمان کی خشتِ اول ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ جب ہم اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان کی اساس ہی سے محروم ہیں تو ہمارے

اندر دینِ حق کو اپنانے اور اُسے دوسرے ادیان پر غالب کرنے کا جذبۂ صادق کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اسلام کے بارے میں اس عدمِ اعتماد اور بے یقینی نے ہمیں زندہ اور انقلاب انگیز قوم بننے کے بجائے محض راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے جسے باطل کے جھکڑ جس طرف چاہتے ہیں اڑا کر لے جاتے ہیں۔ چٹانیں اس وقت تک مربوط و مضبوط رہتی ہیں جب تک اُن کے عناصرِ ترکیبی کے درمیان ہم آہنگی اور پیوستگی موجود ہو، مگر جب اُن کے اجزا خارج سے مختلف اثرات قبول کرنا شروع کر دیں تو پھر نہ صرف ان کا باہمی ربط غائب ہو جاتا ہے بلکہ ان میں بڑی بڑی دراڑیں اور مہیب شگاف پڑ جاتے ہیں اور یہ چٹانیں بعد میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتی ہیں۔

امتِ مُسلمہ کے اندر آج جو ہمہ گیر فساد اور انتشار پایا جاتا ہے اور جسے اتحاد، تنظیم اور اخوت کے فلک شگاف نعرے اور اتفاق کی برکتوں کے بڑے دلچسپ وعظ بھی دُور نہیں کر سکے اس کی وجہ ایک ہی ہے کہ ہم نے اسلام کو دل کی گہرائیوں سے قبول نہیں کیا۔ تصدیق بالقلب بلاشبہ غیر مرئی کیفیت ہے لیکن یہ کوئی ایسی غیر محسوس واردات نہیں جس کے اثرات انسانی زندگی کے کسی پہلو میں بھی نمایاں نہ ہونے پائیں۔ یہ ایک مقناطیسی کشش ہے جو سب سے پہلے انسان کے احساسات و جذبات اُس کے افکار و نظریات کے درمیان ایک معنوی ربط اور مقصدی ترتیب پیدا کرتی ہے۔ پھر ایک ہی طرزِ فکر کے حاملین کو ایک دوسرے کے ساتھ بڑے مضبوط اور پائیدار رشتوں میں جوڑتی ہے۔ اُن کے اندر تنظیم اور اتحاد پیدا کرتی ہے اور اس کے بعد اُن کی صلاحیتوں کو ایک خاص مقصد کے حصول کی راہ میں لگاتی ہے۔

آج ہمیں مختلف اطراف سے اسلام کے بارے میں عجیب و غریب نعرے سنائی دے رہے ہیں۔ کہیں اسلامی سوشلزم کی آواز بلند ہوتی ہے، کہیں اسلامی آمریت کے تذکرے ہو رہے ہیں۔ کہیں اسلام کو جدید بنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ الغرض اسلام اِس دور میں عملِ جراحی کی نازک منزلوں سے گزر رہا ہے۔ اگر یہ صورتِ حال کچھ مدت تک قائم رہی تو اس دین کا بُری طرح سے حلیہ بگڑ جائے گا کہ ایک عام آدمی کے لیے دینِ حق کی پہچان مشکل ہو جائے گی۔ جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نعرہ لے کر اُٹھے ہیں اور

اسی میں ملّتِ اسلامیہ کی نجات دیکھتے ہیں، وہ فہم وفراست کے دعووں کے باوجود اتنی سادہ سی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان دو اَن میل نظاموں کے درمیان کس طرح جوڑ قائم ہو سکتا ہے۔ اگر یہ حضرات اپنے اس دعوے میں مخلص ہیں تو پھر ان کے بارے میں کم سے کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑے فریب میں مبتلا ہیں۔ ایک ایسا فریب جس کا شکار معمولی عقل وفہم کا مالک بھی نہیں ہو سکتا۔ اس دعوے سے ان لوگوں کی اسلام اور سوشلزم دونوں کے بارے میں جہالت اور ناواقفیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ حضرات فی الحقیقت جان بوجھ کر یہ کہہ رہے ہیں تو پھر یہ پوری امت بلکہ پوری انسانیت کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ "اجتماعی عدل" کی جس ترکیب سے یہ قوم کو اُلو بنانے کا عزم رکھتے ہیں وہ بالکل ایک اضافی تصوّر ہے جس کے معنی اسلام اور سوشلزم میں بالکل الگ الگ ہیں۔ ان دونوں نظاموں کے درمیان اساسی فرق ہے اور ان کے مابین کوئی چیز بھی قدر مشترک کی حیثیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ ان دونوں نظاموں کی بنیادی اقدار ایک دوسرے سے یکسر جداگانہ ہیں۔ اسلام کا سارا نظام خشتِ اوّل سے لے کر کنگرے تک خدا پرستی کی بنیاد پر قائم ہے۔ خدا پرستی کا یہ تصور دینِ حق میں اُس طرح محض رسم اور تکلف کے طور پر موجود نہیں جس طرح کہ کسی ثقافتی شو یا کسی سینما ہال کے افتتاح کے وقت قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یہاں خدا پرستی کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کا پورا نظام مادی اقدار کے بجائے اُن اخلاقی اقدار پر قائم ہے جو ہمیں باری تعالیٰ سے اُس کے رسول کی وساطت سے ملی ہیں۔ اشتراکیت میں الحاد کی طرح فیصلہ کن چیز اُس کی معاشی اور مادی افادیت ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں آخری حتمی اور قطعی معیار خدا کی رضا اور اُس کی ناراضگی ہے۔ اسلام میں سارے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو اخلاقی بنیادوں پر حل کیا جاتا ہے اور اس کے برعکس اشتمالیت اور اشتراکیت میں سارے معاملات کو جیب اور پیٹ کے نقطۂ نظر سے طے کیا جاتا ہے۔

اسی حقیقت کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں انفرادی نفع ونقصان کا جو میزانیہ بنتا ہے وہ اخلاقی قدروں اور اخلاقی فلاح وبہبود کے مطابق بنتا ہے اور اشتراکیت یا کسی دوسرے لادینی نظام میں اس میزانیہ میں اصل اہمیت مادی سُود وزیاں کو حاصل ہوتی ہے۔ اسلام اور اشتراکیت کے درمیان

اس واضح اور بیّن فرق کو ہم یُوں تو زندگی کے ہر قدم پر محسوس کرتے ہیں لیکن مَیں یہاں چند باتیں بطور مثال پیش کرتا ہوں۔ قرآن مجید نے تعدّدِ ازواج کی چند شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے کیونکہ وہ حکیم ذات جس نے انسان کو پیدا کیا ہے وہ اس کے مزاج اور اس کی نفسیاتی کیفیات اور اس کی ضروریات سے پُوری طرح واقف ہے۔ اسے یہ معلوم ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں ایک انسان کی حقیقی ضرورت بھی ہو سکتی ہے۔ آج نفسیات اور حیاتیات میں جو مختلف تحقیقات ہوئی ہیں انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ تعدّد ازواج کی ضرورت بالکل مسلّم اور درست ہے۔ یہاں تک کہ WILL DURRANT وِل ڈیوران جیسا متعصب اہلِ علم بھی اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ جن قوموں نے اپنے ہاں فحاشی کو نیست و نابود کرنا چاہا انہیں تعدّد ازواج کو رواج دینا پڑا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تعدّد ازواج سے بعض اوقات گھروں میں پیچیدگیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور انہی پیچیدگیوں سے بچنے کے لیے مغربی قوموں نے فحاشی کو اختیار کیا ہے لیکن اسلام کے نزدیک ان پیچیدگیوں کے مقابلے میں فحاشی زیادہ قابلِ مذمّت اور بُری ہے اس لیے اُس نے تعدّدِ ازواج کی اجازت دی ہے۔

یہی حال ضبطِ تولید کا ہے۔ اسلامی نظامِ حیات میں معاشی استحکام کا بھی ایک مقام ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑی مؤثر تدابیر بتائی ہیں لیکن اُس کے ہاں اقدار کی جو نزاز و نصب ہے اس میں اخلاقی استحکام معاشی استحکام سے کہیں زیادہ وزنی ہے۔ اس لیے یہاں اصل اہمیت اخلاقی استحکام کو ہی حاصل ہو گی۔ کیونکہ اس میں بگاڑ پیدا ہونے سے اس کا سارا ڈھانچہ ہل کر رہ جاتا ہے۔

کسی نظامِ حیات میں اصل چیز وہ اقدار ہیں جو مختلف شعبوں اور مختلف افعال و اعمال کے درمیان تناسب قائم کر کے اُن کی اہمیت متعین کرتی ہیں۔ ایک نظام جس میں زندگی کے سارے

(باقی صفحہ ۷ پر)

تفہیم القرآن

الطّور

(۲)

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے ؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے[۲۶]۔ اگر یہ اپنے اِس قول میں سچے ہیں تو اِسی شان کا ایک کلام بنا لائیں[۲۷]۔

---

[۲۶] دوسرے الفاظ میں اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قریش کے جو لوگ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا تصنیف کردہ کلام کہتے ہیں خود اُن کا دل یہ جانتا ہے کہ یہ آپ کا کلام نہیں ہو سکتا، اور دوسرے وہ لوگ بھی جو اہلِ زبان ہیں نہ صرف یہ کہ اِسے سن کر صاف محسوس کر لیتے ہیں کہ یہ انسانی کلام سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے بلکہ اُن میں سے جو شخص بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف ہے وہ کبھی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ یہ واقعی آپ ہی کا کلام ہے۔ پس صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ قرآن کو آپ کی تصنیف قرار دینے والے دراصل ایمان نہیں لانا چاہتے اس لیے وہ طرح طرح کے جھوٹے بہانے گھڑ رہے ہیں جن میں سے ایک بہانہ یہ بھی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۲۷۲ تا ۲۷۴ - جلد سوم، ص ۴۳۵ تا ۴۳۰، ۶۴۱ تا ۶۴۳ - ۱۱، تا ۱۲۷، جلد چہارم، ص ۳۴ تا ۳۶ - ۴۶۳ تا ۴۶۵ - ۶۰۴ - ۶۰۵)

[۲۷] یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سرے سے انسانی کلام ہی نہیں ہے اور یہ بات انسان کی قدرت سے باہر ہے کہ ایسا کلام تصنیف کر سکے۔ اگر تم اسے انسانی کلام کہتے ہو تو اِس پائے کا کوئی کلام لا کر دکھاؤ جسے کسی انسان نے تصنیف کیا ہو۔ یہ چیلنج نہ صرف قریش کو، بلکہ تمام دنیا کے منکرین کو سب سے پہلے اِس آیت میں دیا گیا تھا۔ اس کے بعد یہ تین مرتبہ مکۂ معظمہ میں اور پھر آخری بار مدینۂ منورہ میں دہرایا گیا (ملاحظہ ہو یونس، آیت ۳۸ - ہود، ۱۳ - بنی اسرائیل، ۸۸ - البقرہ، ۲۳)

مگر کوئی اس کا جواب دینے کی نہ اُس وقت ہمت کر سکا نہ اُس کے بعد آج تک کسی کی یہ جرأت ہوئی کہ قرآن کے مقابلہ میں کسی انسانی تصنیف کو لے آئے۔

بعض لوگ اِس چیلنج کی حقیقی نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ ایک قرآن ہی کیا، کسی شخص کے اسٹائل میں بھی دوسرا کوئی شخص نثر یا نظم لکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ ہومر، رومی، شیکسپیئر، گوئٹے، غالب، ٹیگور، اقبال سب ہی اس لحاظ سے بے مثل ہیں کہ ان کی نقل اتار کر انہی جیسا کلام بنا لانا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ قرآن کے چیلنج کا یہ جواب دینے والے دراصل اس غلط فہمی میں ہیں کہ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ کا مطلب قرآن کے اسٹائل میں اُس جیسی کوئی کتاب لکھ دینا ہے۔ حالانکہ اس سے مراد اسٹائل میں مماثلت نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس پائے اور اِس شان اور اِس مرتبے کی کوئی کتاب لے آؤ جو صرف عربی ہی میں نہیں، دنیا کی کسی زبان میں اُن خصوصیات کے لحاظ سے قرآن کی مدِمقابل قرار پا سکے جن کی بنا پر قرآن ایک معجزہ ہے۔ مختصراً چند بڑی بڑی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں جن کی بنا پر قرآن پہلے بھی معجزہ تھا اور آج بھی معجزہ ہے:

۱۔ جس زبان میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اُس کے ادب کا وہ بلند ترین اور مکمل ترین نمونہ ہے۔ پوری کتاب میں ایک لفظ اور ایک جملہ بھی معیار سے گرا ہوا نہیں ہے۔ جس مضمون کو بھی ادا کیا گیا ہے موزوں ترین الفاظ اور مناسب ترین اندازِ بیان میں ادا کیا گیا ہے۔ ایک ہی مضمون بار بار بیان ہوا ہے اور ہر مرتبہ پیرایۂ بیان نیا ہے جس سے تکرار کی بدنمائی کہیں پیدا نہیں ہوتی۔ اوّل سے لے کر آخر تک ساری کتاب میں الفاظ کی نشست ایسی ہے جیسے نگینے تراش کر جڑے گئے ہوں۔ کلام اتنا مؤثر ہے کہ کوئی زبان داں آدمی اسے سُن کر سر دُھنے بغیر نہیں رہ سکتا، حتیٰ کہ منکر اور مخالف کی رُوح بھی وجد کرنے لگتی ہے۔ ۱۴ سو برس گزرنے کے بعد بھی آج تک یہ کتاب اپنی زبان کے ادب کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے جس کے برابر تو درکنار، جس کے قریب بھی اس زبان کی کوئی کتاب اپنی ادبی قدر و قیمت میں نہیں پہنچتی۔ یہی نہیں، بلکہ یہ کتاب عربی زبان کو اس طرح پکڑ کر بیٹھ گئی ہے کہ ۱۴ صدیاں گزر جانے پر بھی اِس زبان کا معیارِ فصاحت وہی ہے جو اس کتاب نے قائم کر دیا تھا، حالانکہ اتنی مدت میں زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو اتنی طویل مدت تک املاء، انشاء، محاورے، قواعدِ زبان اور استعمالِ الفاظ میں ایک ہی شان پر باقی رہ گئی ہو۔ لیکن یہ صرف قرآن کی طاقت

ہے جس نے عربی زبان کو اپنے مقام سے ہلنے نہ دیا۔ اُس کا ایک لفظ بھی آج تک متروک نہیں ہوا ہے۔ اُس کا ہر محاورہ آج تک عربی ادب میں مستعمل ہے۔ اُس کا ادب آج بھی عربی کا معیاری ادب ہے، اور تقریر و تحریر میں آج بھی فصیح زبان وہی مانی جاتی ہے جو ۱۴ سو برس پہلے قرآن میں استعمال ہوئی تھی۔ کیا دنیا کی کسی زبان میں کوئی انسانی تصنیف اس شان کی ہے؟

۲۔ یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جس نے نوعِ انسانی کے افکار، اخلاق، تہذیب اور طرزِ زندگی پر اتنی وسعت، اتنی گہرائی اور اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اثر ڈالا ہے جس کی کوئی نظیر دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ پہلے اس کی تاثیر نے ایک قوم کو بدلا اور پھر اُس قوم نے اٹھ کر دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کو بدل ڈالا۔ کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے جو اس قدر انقلاب انگیز ثابت ہوئی ہو۔ یہ کتاب صرف کاغذ کے صفحات پر لکھی نہیں رہ گئی ہے بلکہ عمل کی دنیا میں اس کے ایک ایک لفظ نے خیالات کی تشکیل اور ایک مستقل تہذیب کی تعمیر کی ہے۔ ۱۴ سو برس سے اس کے اِن اثرات کا سلسلہ جاری ہے، اور روز بروز اس کے یہ اثرات پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

۳۔ جس موضوع سے یہ کتاب بحث کرتی ہے وہ ایک وسیع ترین موضوع ہے جس کا دائرہ ازل سے ابد تک پُوری کائنات پر حاوی ہے۔ وہ کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام اور اس کے نظم و آئین پر کلام کرتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اِس کائنات کا خالق اور ناظم و مدبّر کون ہے، کیا اُس کی صفات ہیں، کیا اُس کے اختیارات ہیں، اور وہ حقیقتِ نفس الامری کیا ہے جس پر اس نے یہ پُورا نظامِ عالم قائم کیا ہے۔ وہ اِس جہان میں انسان کی حیثیت اور اس کا مقام ٹھیک ٹھیک متشخص کر کے بتاتی ہے کہ یہ اُس کا فطری مقام اور یہ اُس کی پیدائشی حیثیت ہے جسے بدل دینے پر وہ قادر نہیں ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس مقام اور اس حیثیت کے لحاظ سے انسان کے لیے فکر و عمل کا صحیح راستہ کیا ہے جو حقیقت سے پُوری مطابقت رکھتا ہے اور غلط راستے کیا ہیں جو حقیقت سے متصادم ہوتے ہیں۔ صحیح راستے کے صحیح ہونے اور غلط راستوں کے غلط ہونے پر وہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز سے، نظامِ کائنات کے ایک ایک گوشے سے، انسان کے اپنے نفس اور اس کے وجود سے اور انسان کی اپنی تاریخ سے بے شمار دلائل پیش کرتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان غلط راستوں پر کیسے اور کن اسباب سے پڑتا رہا ہے، اور صحیح راستہ، جو ہمیشہ سے ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا، کس ذریعہ سے اُس کو معلوم ہو سکتا ہے اور

کس طرح ہر زمانے میں اُس کو بتایا جاتا رہا ہے۔ وہ صحیح راستے کی صرف نشان دہی کر کے نہیں رہ جاتی بلکہ اس راستے پر چلنے کے لیے ایک پورے نظامِ زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہے جس میں عقائد، اخلاق، تزکیۂ نفس، عبادات، معاشرت، تہذیب، تمدن، معیشت، سیاست، عدالت، قانون، غرض حیاتِ انسانی کے ہر پہلو سے متعلق ایک نہایت مربوط ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے۔ مزید براں وہ پوری تفصیل کے ساتھ بتاتی ہے کہ اس صحیح راستے کی پیروی کرنے اور اُن غلط راستوں پر چلنے کے کیا نتائج اس دنیا میں ہیں اور کیا نتائج دنیا کا موجودہ نظام ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے عالم میں رونما ہونے والے ہیں۔ وہ اِس دنیا کے ختم ہونے اور دوسرا عالم برپا ہونے کی نہایت مفصل کیفیت بیان کرتی ہے، اس تغیّر کے تمام مراحل ایک ایک کر کے بتاتی ہے، دوسرے عالم کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھینچ دیتی ہے، اور پھر بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ وہاں انسان کیسے ایک دوسری زندگی پائے گا، کس طرح اس کی دنیوی زندگی کے اعمال کا محاسبہ ہوگا، کن امور کی اُس سے باز پُرس ہوگی، کیسی ناقابلِ انکار صورت میں اس کا پورا نامۂ اعمال اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا، کیسی زبردست شہادتیں اُس کے ثبوت میں پیش کی جائیں گی، جزا اور سزا پانے والے کیوں جزا اور سزا پائیں گے، جزا پانے والوں کو کیسے انعامات ملیں گے اور سزا پانے والے کس کس شکل میں اپنے اعمال کے نتائج بھگتیں گے۔ اس وسیع مضمون پر جو کلام اس کتاب میں کیا گیا ہے وہ اس حیثیت سے نہیں ہے کہ اس کا مصنف کچھ صغریٰ کبریٰ جوڑ کر چند قیاسات کی ایک عمارت تعمیر کر رہا ہے، بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ اس کا مصنف حقیقت کا براہِ راست علم رکھتا ہے، اس کی نگاہ ازل سے ابد تک سب کچھ دیکھ رہی ہے، تمام حقائق اُس پر عیاں ہیں، کائنات پوری کی پوری اُس کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے، نوعِ انسانی کے آغاز سے اس کے خاتمہ تک ہی نہیں بلکہ خاتمہ کے بعد اس کی دوسری زندگی تک بھی وہ اس کو بیک نظر دیکھ رہا ہے، اور وہ قیاس و گمان کی بنا پر نہیں بلکہ علم کی بنیاد پر انسان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ جن حقائق کو علم کی حیثیت سے وہ پیش کرتا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی آج تک غلط ثابت نہیں کیا جا سکا ہے۔ جو تصورِ کائنات و انسان وہ پیش کرتا ہے وہ تمام مظاہر اور واقعات کی مکمل توجیہ کرتا ہے اور ہر شعبۂ علم میں تحقیق کی بنیاد بن سکتا ہے۔ فلسفہ و سائنس اور علومِ عمران کے تمام آخری مسائل کے جوابات اس کے کلام میں موجود ہیں اور ان سب کے درمیان ایسا منطقی ربط ہے کہ ان پر ایک مکمل، مربوط اور جامع نظامِ فکر قائم ہوتا ہے۔ پھر عملی حیثیت سے جو رہنمائی

اس نے زندگی کے ہر پہلو کے متعلق انسان کو دی ہے وہ صرف انتہائی معقول اور انتہائی پاکیزہ ہی نہیں ہے بلکہ ۱۴ سو سال سے روئے زمین کے مختلف گوشوں میں بے شمار انسان بالفعل اس کی پیروی کر رہے ہیں اور تجربے نے اس کو بہترین ثابت کیا ہے۔ کیا اس شان کی کوئی انسانی تصنیف دنیا میں موجود ہے یا کبھی موجود رہی ہے جسے اِس کتاب کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہو؟

۴۔ یہ کتاب پُوری کی پُوری بیک وقت لکھ کر دنیا کے سامنے پیش نہیں کر دی گئی تھی بلکہ چند ابتدائی ہدایات کے ساتھ ایک تحریکِ اصلاح کا آغاز کیا گیا تھا اور اس کے بعد ۲۳ سال تک وہ تحریک جن جن مرحلوں سے گزرتی رہی ان کے حالات اور ان کی ضروریات کے مطابق اس کے اجزاء اُس تحریک کے رہنما کی زبان سے کبھی طویل خطبوں اور کبھی مختصر جملوں کی شکل میں ادا ہوتے رہے۔ پھر اس مشن کی تکمیل پر مختلف اوقات میں صادر ہونے والے یہ اجزاء اُس مکمل کتاب کی صورت میں مرتب ہو کر دنیا کے سامنے رکھ دیئے گئے جسے "قرآن" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تحریک کے رہنما کا بیان ہے کہ یہ خطبے اور جُملے اس کے طبعزاد نہیں ہیں بلکہ خداوند عالم کی طرف سے اس پر نازل ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شخص انہیں خود اُس رہنما کے طبعزاد قرار دیتا ہے تو وہ دنیا کی پُوری تاریخ سے کوئی نظیر ایسی پیش کرے کہ کسی انسان نے سالہا سال تک مسلسل ایک زبردست اجتماعی تحریک کی بطور خود رہنمائی کرتے ہوئے کبھی ایک واعظ اور معلّمِ اخلاق کی حیثیت سے، کبھی ایک مظلوم جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے، کبھی ایک مملکت کے فرمانروا کی حیثیت سے، کبھی ایک برسرِ جنگ فوج کے قائد کی حیثیت سے، کبھی ایک فاتح کی حیثیت سے، کبھی ایک شارع اور مقنن کی حیثیت سے، غرض بکثرت مختلف حالات اور اوقات میں بہت سی مختلف حیثیتوں سے جو مختلف تقریریں کی ہوں یا باتیں کہی ہوں وہ جمع ہو کر ایک مکمل، مربوط اور جامع نظامِ فکر و عمل بنا دیں۔ ان میں کہیں کوئی تناقض اور تضاد نہ پایا جائے، ان میں ابتداء سے انتہا تک ایک ہی مرکزی تخیل اور سلسلۂ فکر کارفرما نظر آئے۔ اس نے اوّل روز سے اپنی دعوت کی جو بنیاد بیان کی ہو آخری دن تک اُسی بنیاد پر وہ عقائد و اعمال کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام بناتا چلا جائے جس کا ہر جُز دوسرے اجزاء سے کامل مطابقت رکھتا ہو، اور اس مجموعہ کو پڑھنے والا کوئی صاحبِ بصیرت آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہے کہ تحریک کا آغاز کرتے وقت اُس کے محرک کے سامنے آخری مرحلے تک کا پُورا نقشہ موجود تھا اور ایسا کبھی نہیں ہُوا کہ بیچ کے کسی مقام

پر اُس کے ذہن میں کوئی ایسا خیال آیا ہو جو پہلے اس پر منکشف نہ تھا یا جسے بعد میں اس کو بدلنا پڑا۔ اِس شان کا کوئی انسان اگر کبھی گزرا ہو جس نے اپنے ذہن کی خلاقی کا یہ کمال دکھایا ہو تو اس کی نشان دہی کی جائے۔

۵- جس رہنما کی زبان پر یہ خطبے اور مضامین جاری ہوئے تھے وہ یکایک کسی گوشے سے نکل کر صرف اِن کو سنانے کے لیے نہیں آجاتا تھا اور انہیں سنانے کے بعد کہیں چلا نہیں جاتا تھا۔ وہ اِس تحریک کے آغاز سے پہلے بھی انسانی معاشرے میں زندگی بسر کر چکا تھا اور اُس کے بعد بھی وہ زندگی کی آخری ساعت تک ہر وقت اسی معاشرے میں رہتا تھا۔ اس کی گفتگو اور تقریروں کی زبان اور طرزِ بیان سے لوگ بخوبی آشنا تھے۔ احادیث میں اُن کا ایک بڑا حصہ اب بھی محفوظ ہے جسے بعد کے عربی داں لوگ پڑھ کر خود بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ اُس رہنما کا اپنا طرزِ کلام کیا تھا۔ اُس کے ہم زبان لوگ اُس وقت بھی صاف محسوس کرتے تھے اور آج بھی عربی زبان کے جاننے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کتاب کی زبان اور اس کا اسٹائل اس رہنما کی زبان اور اس کے اسٹائل سے بہت مختلف ہے، حتیٰ کہ جہاں اس کے کسی خطبے کے بیچ میں اِس کتاب کی کوئی عبارت آجاتی ہے وہاں دونوں کی زبان کا فرق بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں کوئی انسان کبھی اس بات پر قادر ہوا ہے یا ہو سکتا ہے کہ سالہا سال تک دو قطعی مختلف اسٹائلوں میں کلام کرنے کا تکلف نباہتا چلا جائے اور کبھی یہ راز فاش نہ ہو سکے کہ یہ دو الگ اسٹائل دراصل ایک ہی شخص کے ہیں؟ عارضی اور وقتی طور پر اس قسم کے تصنع میں کامیاب ہو جانا تو ممکن ہے۔ لیکن مسلسل ۲۳ سال تک ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص جب خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر کلام کرے تو اس کی زبان اور اسٹائل کچھ ہو، اور جب خود اپنی طرف سے گفتگو یا تقریر کرے تو اس کی زبان اور اس کا اسٹائل بالکل ہی کچھ اور ہو۔

۶- وہ رہنما اس تحریک کی قیادت کے دوران میں مختلف حالات سے دوچار ہوتا رہا۔ کبھی برسوں وہ اپنے ہم وطنوں اور اپنے قبیلے والوں کی تضحیک، توہین اور سخت ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا۔ کبھی اس کے ساتھیوں پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ وہ ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئے۔ کبھی دشمنوں نے اس کے قتل کی سازشیں کیں۔ کبھی خود اسے اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔ کبھی اس کو انتہائی عُسرت اور فاقہ کشی کی زندگی گزارنی پڑی۔ کبھی اسے پیہم لڑائیوں سے سابقہ پیش آیا جن میں شکست اور فتح، دونوں ہی ہوتی رہیں۔ کبھی وہ دشمنوں پر غالب آیا اور وہی دشمن جنہوں نے

کیا یہ کسی خالق کے بغیر خود پیدا ہو گئے ہیں؟ یا یہ خود اپنے خالق ہیں؟ یا زمین اور آسمانوں کو انہوں نے پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ یقین نہیں رکھتے۔[۲۸]

اس پر ظلم توڑے تھے، اس کے سامنے سرنگوں نظر آئے کبھی اسے وہ اقتدار نصیب ہوا جو کم ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ اِن تمام حالات میں ایک انسان کے جذبات ظاہر ہے کہ یکساں نہیں رہ سکتے۔ اس رہنما نے ان مختلف مواقع پر خود اپنی ذاتی حیثیت میں جب کبھی کلام کیا، اُس میں اُن جذبات کا اثر نمایاں نظر آتا ہے جو ایسے مواقع پر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں لیکن خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر ان مختلف حالات میں جو کلام اس کی زبان سے سنا گیا وہ انسانی جذبات سے بالکل خالی ہے۔ کسی ایک مقام پر بھی کوئی بڑے سے بڑا نقاد انگلی رکھ کر یہ نہیں بتا سکتا کہ یہاں انسانی جذبات کار فرما نظر آتے ہیں۔

۷۔ جو وسیع اور جامع علم اِس کتاب میں پایا جاتا ہے وہ اُس زمانے کے اہلِ عرب اور اہلِ روم و یونان و ایران تو درکنار اِس بیسویں صدی کے اکابر اہلِ علم میں سے بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ فلسفہ، سائنس اور علومِ عمران کی کسی ایک شاخ کے مطالعہ میں اپنی عمر کھپا دینے کے بعد آدمی کو پتہ چلتا ہے کہ اُس شعبۂ علم کے آخری مسائل کیا ہیں، اور پھر جب وہ غائر نگاہ سے قرآن کو دیکھتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں اُن مسائل کا ایک واضح جواب موجود ہے۔ یہ معاملہ کسی ایک علم تک محدود نہیں ہے بلکہ ان تمام علوم کے باب میں صحیح ہے جو کائنات اور انسان سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ۱۴ سو برس پہلے ریگستان عرب میں ایک اُمّی کو علم کے ہر گوشے پر اتنی وسیع نظر حاصل تھی اور اُس نے ہر بنیادی مسئلے پر غور و خوض کر کے اس کا ایک صاف اور قطعی جواب سوچ لیا تھا؟

اعجازِ قرآن کے اگرچہ اور بھی متعدد وجوہ ہیں، لیکن صرف ان چند وجوہ ہی پر اگر آدمی غور کرے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کا معجزہ ہونا جتنا نزولِ قرآن کے زمانے میں واضح تھا اُس سے بدرجہا زیادہ آج واضح ہے اور انشاء اللہ قیامت تک یہ واضح تر ہوتا چلا جائے گا۔

۲۸۔ اِس سے پہلے جو سوالات چھیڑے گئے تھے وہ کفارِ مکہ کو یہ احساس دلانے کے لیے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے رسالت کو جھٹلانے کے لیے جو باتیں وہ بنا رہے ہیں وہ کس قدر غیر معقول ہیں۔

کیا تیرے رب کے خزانے اِن کے قبضے میں ہیں ؟ یا اُن پر اُنہی کا حکم چلتا ہے ؟[۲۹]

کیا اِن کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر یہ عالمِ بالا کی سُن گن لیتے ہیں ؟ اِن میں سے جس نے

اب اِس آیت میں ان کے سامنے یہ سوال رکھا گیا ہے کہ جو دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں آخر اُس میں وہ بات کیا ہے جس پر تم لوگ اس قدر بگڑ رہے ہو۔ وہ یہی تو کہہ رہے ہیں کہ اللہ تمہارا خالق ہے اور اُسی کی تم کو بندگی کرنی چاہیے۔ اِس پر تمہارے بگڑنے کی آخر کیا معقول وجہ ہے ؟ کیا تم خود بن گئے ہو، کسی بنانے والے نے تمہیں نہیں بنایا ؟ یا اپنے بنانے والے تم خود ہو ؟ یا یہ وسیع کائنات تمہاری بنائی ہوئی ہے ؟ اگر ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ہے اور تم خود مانتے ہو کہ تمہارا خالق بھی اللہ ہی ہے اور اِس کائنات کا خالق بھی وہی ہے، تو اُس شخص پر تمہیں کیوں غصہ آتا ہے جو تم سے کہتا ہے کہ وہی اللہ تمہاری بندگی و پرستش کا مستحق ہے ؟ غصے کے لائق بات یہ ہے یا یہ کہ جو خالق نہیں ہیں اُن کی بندگی کی جائے اور جو خالق ہے اُس کی بندگی نہ کی جائے ؟ تم زبان سے یہ اقرار تو ضرور کرتے ہو کہ اللہ ہی تمہارا اور کائنات کا خالق ہے، لیکن اگر تمہیں واقعی اِس بات کا یقین ہوتا تو اس کی بندگی کی طرف بلانے والے کے پیچھے اِس طرح ہاتھ دھو کر نہ پڑ جاتے۔

یہ ایسا زبردست چبھتا ہوا سوال تھا کہ اِس نے مشرکین کے عقیدے کی چولیں ہلا دیں۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ جبیر بن مُطعم جنگِ بدر کے بعد قریش کے قیدیوں کی رہائی پر بات چیت کرنے کے لیے کفّارِ مکہ کی طرف سے مدینہ آئے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے اور اُس میں سورۂ طور زیرِ تلاوت تھی۔ اُن کا اپنا بیان یہ ہے کہ جب حضورؐ اس مقام پر پہنچے تو میرا دل میرے سینے سے اڑا جاتا تھا۔ بعد میں اُن کے مسلمان ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اُس روز یہ آیات سُن کر اسلام ان کے دل میں جڑ پکڑ چکا تھا۔

۲۹ یہ کفّارِ مکہ کے اِس اعتراض کا جواب ہے کہ آخر محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کیوں رسول بنائے گئے۔ اِس جواب کا مطلب یہ ہے کہ اِن لوگوں کو عبادتِ غیر اللہ کی گمراہی سے نکالنے کے لیے بہرحال کسی نہ کسی کو تو رسول مقرر کیا جانا ہی تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنا کس کا کام ہے کہ خدا اپنا رسول کس کو بنائے اور کس کو نہ بنائے ؟ اگر یہ لوگ خدا کے بنائے ہوئے رسول کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو اس کے

سن گن لی ہو وہ لائے کوئی کھلی دلیل۔ کیا اللہ کے لیے تو ہیں بیٹیاں اور تم لوگوں کے لیے ہیں بیٹے؟ ۳۰
کیا تم اِن سے کوئی اجر مانگتے ہو کہ یہ زبردستی پڑی ہوئی چٹی کے بوجھ تلے دبے جاتے ہیں؟ ۳۱

معنی یہ ہیں کہ یا تو خدا کی خدائی کا مالک یہ اپنے آپ کو سمجھ بیٹھے ہیں، یا پھر ان کا زعم یہ ہے کہ اپنی خدائی کا مالک تو خدا ہی ہو مگر اُس میں حکم اِن کا چلے۔

۳۰ ان مختصر فقروں میں ایک بڑے مفصل استدلال کو سمو دیا گیا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر تمہیں رسول کی بات ماننے سے انکار ہے تو تمہارے پاس خود حقیقت کو جاننے کا آخر ذریعہ کیا ہے؟ کیا تم میں سے کوئی شخص عالمِ بالا میں پہنچا ہے اور اللہ تعالیٰ، یا اُس کے فرشتوں سے اُس نے براہِ راست یہ معلوم کر لیا ہے کہ وہ عقائد بالکل حقیقت کے مطابق ہیں جن پر تم لوگ اپنے دین کی بنا رکھے ہوئے ہو؟ یہ دعویٰ اگر کسی کو ہے تو وہ سامنے آئے اور بتائے کہ اُسے کب اور کیسے عالمِ بالا تک رسائی حاصل ہوئی ہے اور کیا علم وہ وہاں سے لے کر آیا ہے۔ اور اگر یہ دعویٰ تم نہیں رکھتے تو پھر خود ہی غور کرو کہ اس سے زیادہ مضحکہ انگیز عقیدہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ تم اللہ رب العٰلمین کے لیے اولاد تجویز کرتے ہو، اور اولاد بھی لڑکیاں، جنہیں تم خود اپنے لیے باعثِ ننگ و عار سمجھتے ہو۔ علم کے بغیر اس قسم کی صریح جہالتوں کے اندھیرے میں بھٹک رہے ہو۔ اور خدا کی طرف سے جو شخص علم کی روشنی تمہارے سامنے پیش کرتا ہے اس کی جان کے دشمن ہوئے جاتے ہو۔

۳۱ سوال کا اصل روئے سخن کفار کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر رسول تم سے کوئی غرض رکھتا اور اپنی کسی ذاتی منفعت کے لیے یہ ساری دوڑ دھوپ کر رہا ہوتا تو اس سے تمہارے بھاگنے کی کم از کم ایک معقول وجہ ہوتی۔ مگر تم خود جانتے ہو کہ وہ اپنی اِس دعوت میں بالکل بے غرض ہے اور محض تمہاری بھلائی کے لیے اپنی جان کھپا رہا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم ٹھنڈے دل سے اُس کی بات سُننے تک کے روادار نہیں ہو؟ اس سوال میں ایک لطیف تعریض بھی ہے۔ ساری دنیا کے بناوٹی پیشوا اور مذہبی آستانوں کے مجاوروں کی طرح عرب میں بھی مشرکین کے پیشوا اور پنڈت اور پروہت کھلا کھلا مذہبی کاروبار چلا رہے تھے۔ اِس پر یہ سوال اُن کے سامنے رکھ دیا گیا کہ ایک طرف یہ مذہب کے تاجر ہیں جو علانیہ تم سے نذریں، نیازیں، اور ہر مذہبی خدمت کی اُجرتیں وصول کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ایک شخص کامل بے غرضی کے ساتھ، بلکہ اپنے تجارتی کاروبار کو برباد کر کے تمہیں نہایت

کیا ان کے پاس غیب کے حقائق کا علم ہے کہ اُس کی بنا پر یہ لکھ رہے ہوں؟[۳۲]
کیا یہ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں؟[۳۳] اگر یہ بات ہے تو کفر کرنے والوں پر ان کی چال الٹی ہی پڑے گی۔[۳۴]

معقول دلائل سے دین کا سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب یہ صریح بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے کہ تم اس سے بھاگتے اور اُن کی طرف دوڑتے ہو۔

۳۲؎ یعنی رسول تمہارے سامنے جو حقائق پیش کر رہا ہے اُن کو جھٹلانے کے لیے آخر تمہارے پاس وہ کونسا علم ہے جسے تم اِس دعوے کے ساتھ پیش کر سکو کہ پردۂ ظاہر کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقتوں کو تم براہِ راست جانتے ہو؟ کیا واقعی تمہیں یہ علم ہے کہ خدا ایک نہیں ہے بلکہ وہ سب بھی خدائی صفات و اختیارات رکھتے ہیں جنہیں تم نے معبود بنا رکھا ہے؟ کیا واقعی تم نے فرشتوں کو دیکھا ہے کہ وہ لڑکیاں ہیں اور (نعوذ باللہ) خدا کے ہاں پیدا ہوئی ہیں؟ کیا واقعی تم یہ جانتے ہو کہ کوئی وحی نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی ہے نہ خدا کی طرف سے کسی بندے کے پاس آسکتی ہے؟ کیا واقعی تمہیں اس بات کا علم ہے کہ کوئی قیامت برپا نہیں ہونی ہے اور مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہوگی اور کوئی عالمِ آخرت قائم نہ ہوگا جس میں انسان کا محاسبہ ہو اور اسے جزا و سزا دی جائے؟ اگر اس طرح کے کسی علم کا تمہیں دعویٰ ہے تو کیا تم یہ لکھ کر دینے کے لیے تیار ہو کہ اِن اُمور کے متعلق رسول کے بیانات کی تکذیب تم اس بنا پر کر رہے ہو کہ پردۂ غیب کے پیچھے جھانک کر تم نے یہ دیکھ لیا ہے کہ حقیقت وہ نہیں ہے جو رسول بیان کر رہا ہے؟ اِس مقام پر ایک شخص یہ شبہ ظاہر کر سکتا ہے کہ اس کے جواب میں اگر وہ لوگ ہٹ دھرمی کے ساتھ یہ بات لکھ کر دے دیتے تو کیا یہ استدلال بے معنی نہ ہو جاتا؟ لیکن یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ ہٹ دھرمی کی بنا پر وہ لکھ بھی دیتے تو جس معاشرے میں یہ چیلنج برسرِ عام پیش کیا گیا تھا اس کے عام لوگ اندھے تو نہ تھے۔ ہر شخص جان لیتا کہ یہ لکھا سراسر ہٹ دھرمی کے ساتھ دیا گیا ہے اور در حقیقت رسول کے بیانات کو جھٹلانے کی بنیاد یہ ہرگز نہیں ہے کہ کسی کو اُن کے خلافِ واقعہ ہونے کا علم حاصل ہے۔

۳۳؎ اشارہ ہے اُن تدبیروں کی طرف جو کفارِ مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زک دینے اور آپ کو ہلاک کرنے کے لیے آپس میں بیٹھ بیٹھ کر سوچا کرتے تھے۔

کیا اللہ کے سوا یہ کوئی اور معبود رکھتے ہیں؟ اللہ پاک ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔[۳۵]
یہ لوگ آسمان کے ٹکڑے بھی گرتے ہوئے دیکھ لیں تو کہیں گے یہ بادل ہیں جو اُمڈے چلے آ رہے
ہیں۔[۳۶] پس اے نبی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو یہاں تک کہ یہ اپنے اُس دن کو پہنچ جائیں جس میں

---

۳۴ یہ قرآن کی صریح پیشین گوئیوں میں سے ایک ہے۔ مکی دور کے ابتدائی زمانے میں جب مٹھی بھر بے سرو سامان مسلمانوں کے سوا بظاہر کوئی طاقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ تھی، اور پوری قوم آپ کے خلاف برسرِ پیکار تھی، اسلام اور کفر کا مقابلہ ہر دیکھنے والے کو انتہائی نامساوی مقابلہ نظر آ رہا تھا۔ کوئی شخص بھی اس وقت یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ چند سال کے بعد یہاں کفر کی بساط بالکل اُلٹ جانے والی ہے۔ بلکہ ظاہر بین نگاہ تو یہ دیکھ رہی تھی کہ قریش اور سارے عرب کی مخالفت آخرکار اِس دعوت کا خاتمہ کر کے چھوڑے گی۔ مگر اس حالت میں پوری تحدی کے ساتھ کفار سے یہ صاف صاف کہہ دیا گیا کہ اس دعوت کو نیچا دکھانے کے لیے جو تدبیریں بھی تم کرنا چاہو کر کے دیکھ لو۔ وہ سب الٹی تمہارے ہی خلاف پڑیں گی اور تم اِسے شکست دینے میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکو گے۔

۳۵ یعنی امرِ واقعہ یہ ہے کہ جن کو انہوں نے الٰہ بنا رکھا ہے وہ حقیقت میں الٰہ نہیں ہیں اور شرک سراسر ایک بے اصل چیز ہے۔ اس لیے جو شخص توحید کی دعوت لے کر اٹھا ہے اس کے ساتھ سچائی کی طاقت ہے اور جو لوگ شرک کی حمایت کر رہے ہیں وہ ایک بے حقیقت چیز کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اس لڑائی میں شرک آخر کیسے جیت جائے گا؟

۳۶ اِس ارشاد سے مقصود ایک طرف سردارانِ قریش کی ہٹ دھرمی کو بے نقاب کرنا، اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو تسلی دینا ہے۔ حضورؐ اور صحابۂ کرام کے دل میں بار بار یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ اِن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی معجزہ ایسا دکھا دیا جائے جس سے ان کو نبوتِ محمدیہ کی صداقت معلوم ہو جائے۔ اس پر فرمایا گیا ہے کہ یہ خواہ کوئی معجزہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، بہرحال یہ اس کی تاویل کر کے کسی نہ کسی طرح اپنے کفر پر جمے رہنے کا بہانہ ڈھونڈ نکالیں گے، کیونکہ اِن کے دل ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد دوسرے مقامات پر بھی اُن

یہ مار گرائے جائیں گے، جس دن نہ اِن کی اپنی کوئی چال ان کے کسی کام آئے گی نہ کوئی اِن کی مدد کو آئے گا۔ اور اُس وقت کے آنے سے پہلے بھی ظالموں کے لیے ایک عذاب ہے، مگر ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں۔[۳۸]

اے نبی، اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو،[۳۹] تم ہماری نگاہ میں ہو۔[۴۰] تم جب اٹھو تو اپنے

کی اسی ہٹ دھرمی کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں فرمایا "اگر ہم فرشتے بھی اِن پر نازل کر دیتے اور مُردے ان سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی چیزوں کو ہم ان کی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیتے تب بھی یہ ماننے والے نہ تھے" (آیت ۱۱۱)۔ اور سورۂ حجر میں فرمایا "اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے اور یہ دن دہاڑے اُس میں چڑھنے بھی لگتے، پھر بھی یہ لوگ یہی کہتے کہ ہماری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے" (آیت ۱۵)۔

[۳۸] یہ اُسی مضمون کا اعادہ ہے جو سورۂ السجدہ، آیت ۲۱ میں گزر چکا ہے کہ "اُس بڑے عذاب سے پہلے ہم اِسی دنیا میں کسی نہ کسی چھوٹے عذاب کا مزا انہیں چکھاتے رہیں گے، شاید کہ یہ اپنی باغیانہ روش سے باز آجائیں"۔ یعنی دنیا میں وقتاً فوقتاً شخصی اور قومی مصیبتیں نازل کر کے انہیں یہ یاد دلاتے رہیں گے کہ اوپر کوئی بالاتر طاقت اِن کی قسمتوں کے فیصلے کر رہی ہے اور کوئی اُس کے فیصلوں کو بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ مگر جو لوگ جہالت میں مبتلا ہیں انہوں نے نہ پہلے کبھی اِن واقعات سے سبق لیا ہے نہ آئندہ کبھی لیں گے۔ وہ دنیا میں رونما ہونے والے حوادث کے معنی نہیں سمجھتے، اس لیے ان کی ہر وہ تاویل کرتے ہیں جو حقیقت کے فہم سے اِن کو اور زیادہ دُور لے جانے والی ہو، اور کسی ایسی تاویل کی طرف ان کا ذہن کبھی مائل نہیں ہوتا جس سے اپنی دہریت یا اپنے شرک کی غلطی ان پر واضح ہو جائے۔ یہی بات ہے جو ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہے کہ ان المنافق اذا مَرِضَ ثم اُعفی کان کالبعیر عَقَلَهٗ اھلہ ثم ارسلوہ فلَمْ یدرِلِمَ عقلوہ ولَم یدرِلِمَ ارسلوہ (ابوداود، کتاب الجنائز)۔ یعنی "منافق جب بیمار پڑتا ہے اور پھر اچھا ہو جاتا ہے تو اس کی مثال اُس اونٹ کی سی ہوتی ہے جسے اُس کے مالکوں نے باندھا تو اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیوں باندھا ہے اور جب کھول دیا تو وہ کچھ

رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو،[۴۰] رات کو بھی اس کی تسبیح کیا کرو[۴۱] اور ستارے جب پلٹتے ہیں اُس وقت بھی۔[۴۲] ع ۲

نہ سمجھا کہ کیوں کھول دیا ہے"۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۱۶۱ - ۵۸۶ - ۷۰۱ - ۷۰۲ - جلد چہارم، ص ۷ - ۴ - ۸ - ۴)۔

۳۸؎ دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صبر و استقامت کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی تعمیل پر ڈٹے رہو۔

۳۹؎ یعنی ہم تمہاری نگہبانی کر رہے ہیں۔ تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ نہیں دیا ہے۔

۴۰؎ اس ارشاد کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں، اور بعید نہیں کہ وہ سب ہی مراد ہوں۔

ایک مفہوم یہ ہے کہ جب بھی تم کسی مجلس سے اٹھو تو اللہ کی حمد و تسبیح کر کے اٹھو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اس پر عمل فرماتے تھے، اور آپ نے مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت فرمائی تھی کہ کسی مجلس سے اُٹھتے وقت اللہ کی حمد و تسبیح کر لیا کریں، اس سے اُن تمام باتوں کا کفارہ ادا ہو جاتا ہے جو اُس مجلس میں ہوئی ہوں۔ ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور حاکم نے حضرت ابوہریرہؓ کے واسطے سے حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جو شخص کسی مجلس میں بیٹھا ہو اور اُس میں خوب قیل و قال ہوئی ہو، وہ اگر اٹھنے سے پہلے یہ الفاظ کہے تو اللہ ان باتوں کو معاف کر دیتا ہے جو وہاں ہوئی ہوں: سبحانک اللّٰھم و بحمدک، اشھد ان لا الٰہ الا انت، استغفرک و اتوب الیک۔ خداوندا، میں تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتا ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، میں تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں اور تیرے حضور توبہ کرتا ہوں"۔

دوسرا مفہوم اِس کا یہ ہے کہ جب تم نیند سے بیدار ہو کر اپنے بستر سے اٹھو تو اپنے رب کی تسبیح کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ اس پر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود عمل فرماتے تھے اور اپنے اصحاب کو آپؐ نے یہ تعلیم دی تھی کہ نیند سے جب بیدار ہوں تو یہ الفاظ کہا کریں: لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ له الملک وله الحمد وھو علیٰ کل شیءٍ قدیر، سبحان اللّٰہ، والحمد للّٰہ، ولا الٰہ الا اللّٰہ، واللّٰہ اکبر، ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ۔ (مسند احمد، بخاری بروایتِ عبادہ بن الصامت)۔

تیسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اللہ کی حمد و تسبیح سے اس کا آغاز کرو۔ اسی حکم کی تعمیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرمائی کہ نماز کی ابتدا تکبیر تحریمہ کے بعد ان الفاظ سے کی جائے: سبحانك اللّٰهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالٰی جدك ولا اله غيرك ۔

چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ جب تم اللہ کی طرف دعوت دینے کے لیے اٹھو تو اللہ کی حمد و تسبیح سے اس کا آغاز کرو۔ یہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل معمول تھا کہ آپ ہمیشہ اپنے خطبوں کا آغاز حمد و ثنا سے فرمایا کرتے تھے۔

مفسر ابن جریر نے اس کا ایک اور مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ جب تم دوپہر کو قیلولہ کر کے اٹھو تو نماز پڑھو اور اس سے مراد نماز ظہر ہے۔

۳۵؎ اس سے مراد مغرب و عشا اور تہجد کی نمازیں بھی ہیں، اور تلاوتِ قرآن بھی، اور اللہ کا ذکر بھی۔

۳۶؎ ستاروں کے پلٹنے سے مراد رات کے آخری حصہ میں اُن کا غروب ہونا اور سپیدۂ صبح کے نمودار ہونے پر اُن کی روشنی کا ماند پڑ جانا ہے۔ یہ نمازِ فجر کا وقت ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

تفہیم القرآن

النجم

نام | پہلے ہی لفظ وَالنَّجْمِ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی مضمون کے لحاظ سے سُورۃ کا عنوان نہیں ہے بلکہ محض علامت کے طور پر اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | بخاری، مُسلم، ابوداؤد اور نَسائی میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ: اَوَّلُ سُورَۃٍ اُنْزِلَت فیھا سجدۃٌ النجم (پہلی سورۃ جس میں آیت سجدہ نازل ہوئی النجم ہے)۔ اِس حدیث کے جو اجزاء اَسْوَد بن یزید، ابواسحاق، اور زُہَیر بن معاویہ کی روایات میں حضرت ابن مسعود سے منقول ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن مجید کی وہ پہلی سورۃ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے قریش کے ایک مجمع عام میں (اور ابنِ مردُوْیہ کی روایت کے مطابق حرَم میں) سنایا تھا۔ مجمع میں کافر اور مومن سب موجود تھے۔ آخر میں جب آپ نے آیتِ سجدہ پڑھ کر سجدہ فرمایا تو تمام حاضرین آپ کے ساتھ سجدے میں گر گئے اور مشرکین کے وہ بڑے بڑے سردار تک، جو مخالفت میں پیش پیش تھے، سجدہ کیے بغیر نہ رہ سکے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کفار میں سے صرف ایک شخص اُمیّہ بن خلف کو دیکھا کہ اس نے سجدہ کرنے کے بجائے کچھ مٹی اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگالی اور کہا کہ میرے لیے بس یہی کافی ہے۔ بعد میں میری آنکھوں نے دیکھا کہ وہ کفر کی حالت میں قتل ہوا۔

اس واقعہ کے دوسرے عینی شاہد حضرت مُطَّلِب بن ابی وَداعہ ہیں جو اُس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ نَسائی اور مُسندِ احمد میں ان کا اپنا بیان یہ نقل ہوا ہے کہ جب حضورؐ نے

سورۂ نجم پڑھ کر سجدہ فرمایا اور سب حاضرین آپ کے ساتھ سجدے میں گر گئے تو میں نے سجدہ نہ کیا، اور اسی کی تلافی اب میں اس طرح کرتا ہوں کہ اِس سُورے کی تلاوت کے وقت سجدہ کبھی نہیں چھوڑتا۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ اِس سے پہلے رجب ۵ھ نبوی میں صحابۂ کرام کی ایک مختصر سی جماعت حَبَش کی طرف ہجرت کر چکی تھی۔ پھر جب اُسی سال رمضان میں یہ واقعہ پیش آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے مجمعِ عام میں سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی، اور کافر و مومن سب آپ کے ساتھ سجدے میں گر گئے، تو حَبَش کے مہاجرین تک یہ قصہ اس شکل میں پہنچا کہ کفارِ مکہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ اِس خبر کو سُن کر اُن میں سے کچھ لوگ شوال ۵ھ میں مکہ واپس آ گئے۔ مگر یہاں آ کر معلوم ہُوا کہ ظلم کی چکی اسی طرح چل رہی ہے جس طرح پہلے چل رہی تھی۔ آخر کار دوسری ہجرتِ حبشہ واقع ہوئی جس میں پہلی ہجرت سے بھی زیادہ لوگ مکہ چھوڑ کر چلے گئے۔

اِس طرح یہ بات قریب قریب یقینی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ سورۃ رمضان ۵ھ نبوی میں نازل ہوئی ہے۔

تاریخی پس منظر زمانۂ نزول کی اس تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا حالات تھے جن میں یہ سورۃ نازل ہوئی۔ ابتدائے بعثت کے بعد سے پانچ سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نجی صحبتوں اور مخصوص مجلسوں ہی میں اللہ کا کلام سنا سنا کر لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دیتے رہے تھے۔ اس پُوری مدت میں آپ کو کبھی کسی مجمعِ عام میں قرآن سنانے کا موقع نہ مل سکا تھا، کیونکہ کفار کی سخت مزاحمت اس میں مانع تھی۔ ان کو اس امر کا خوب اندازہ تھا کہ آپ کی شخصیت اور آپ کی تبلیغ میں کس بلا کی کشش، اور قرآن مجید کی آیات میں کس غضب کی تاثیر ہے۔ اس لیے وہ کوشش کرتے تھے کہ اس کلام کو نہ خود سُنیں، نہ کسی کو سننے دیں، اور آپ کے خلاف طرح طرح

کی غلط فہمیاں پھیلا کر محض اپنے جھوٹے پروپیگنڈے کے زور سے آپ کی دعوت کو دبا دیں۔ اِس غرض کے لیے ایک طرف تو وہ جگہ جگہ یہ مشہور کرتے پھر رہے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم بہک گئے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں۔ دوسری طرف اُن کا یہ مستقل طریقِ کار تھا کہ جہاں بھی آپ قرآن سنانے کی کوشش کریں وہاں شور مچا دیا جائے تاکہ لوگ یہ جان ہی نہ سکیں کہ وہ بات کیا ہے جس کی بنا پر آپ کو گمراہ اور بہکا ہُوا آدمی قرار دیا جا رہا ہے۔

اِن حالات میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم حرمِ پاک میں، جہاں قریش کے لوگوں کا ایک بڑا مجمع موجود تھا، یکایک تقریر کرنے کھڑے ہو گئے اور اُس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی زبانِ مبارک پر یہ خطبہ جاری ہُوا جو سورۂ نجم کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اِس کلام کی شدّتِ تاثیر کا حال یہ تھا کہ جب آپ نے اِسے سنانا شروع کیا تو مخالفین کو اس پر شور مچانے کا ہوش ہی نہ رہا، اور خاتمے پر جب آپ نے سجدہ فرمایا تو وہ بھی سجدے میں گر گئے۔ بعد میں اُنہیں سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ ہم سے کیا کمزوری سرزد ہو گئی، اور لوگوں نے بھی اُنہیں اس پر مطعون کرنا شروع کیا کہ دوسروں کو تو یہ کلام سننے سے منع کرتے تھے، آج خود اسے نہ صرف کان لگا کر سنا بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ سجدہ بھی کر گزرے۔ آخر کار انہوں نے یہ بات بنا کر اپنا پیچھا چھڑایا کہ صاحب ہمارے کانوں نے تو اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَالۡعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الۡاُخۡرٰی کے بعد محمدؐ کی زبان سے یہ الفاظ سُنے تھے تلك الغرانقة العلیٰ وان شفاعتهن لترتجیٰ (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت ضرور متوقّع ہے)، اس لیے ہم نے سمجھا کہ محمدؐ ہمارے طریقے پر واپس آ گئے ہیں۔ حالانکہ کوئی پاگل آدمی ہی یہ سوچ سکتا تھا کہ اس پوری سُورۃ کے سیاق و سباق میں اُن فقروں کی بھی کوئی جگہ ہو سکتی ہے جو اُن کا دعویٰ تھا کہ اُن کے کانوں نے سنے ہیں (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۲۴۳ تا ۲۴۵)۔

موضوع اور مضمون | تقریر کا موضوع کفارِ مکہ کو اُس رویّے کی غلطی پر متنبّہ کرنا ہے جو وہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں اختیار کیے ہوئے تھے۔

کلام کا آغاز اِس طرح فرمایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہکے اور بھٹکے ہوئے آدمی نہیں ہیں، جیسا کہ تم ان کے متعلق مشہور کرتے پھر رہے ہو، اور نہ اسلام کی یہ تعلیم اور دعوت انہوں نے خود اپنے دل سے گھڑ لی ہے، جیسا کہ تم اپنے نزدیک سمجھے بیٹھے ہو، بلکہ جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں وہ خالص وحی ہے جو اُن پر نازل کی جاتی ہے۔ جن حقیقتوں کو وہ تمہارے سامنے بیان کرتے ہیں وہ اُن کے اپنے قیاس وگمان کی آفریدہ نہیں ہیں بلکہ اُن کی آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں۔ انہوں نے اُس فرشتے کو خود دیکھا ہے جس کے ذریعہ سے ان کو یہ علم دیا جاتا ہے۔ انہیں اپنے رب کی عظیم نشانیوں کا براہِ راست مشاہدہ کرایا گیا ہے۔ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں سوچ کر نہیں، دیکھ کر کہہ رہے ہیں۔ اُن سے تمہارا جھگڑنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی اندھا آنکھوں والے سے اُس چیز پر جھگڑے جو اُسے نظر نہیں آتی اور آنکھوں والے کو نظر آتی ہے۔

اس کے بعد علی الترتیب تین مضامین ارشاد ہوئے ہیں:

اوّلاً سامعین کو سمجھایا گیا ہے کہ جس دین کی تم پیروی کر رہے ہو اس کی بنیاد محض گمان اور من مانے مفروضات پر قائم ہے۔ تم نے لات اور منات اور عُزّیٰ جیسی چند دیویوں کو معبود بنا رکھا ہے حالانکہ اُلوہیت میں برائے نام بھی ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ تم نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے رکھا ہے، حالانکہ خود اپنے لیے تم بیٹی کو عار سمجھتے ہو۔ تم نے اپنے نزدیک یہ فرض کر لیا ہے کہ تمہارے یہ معبود اللہ تعالیٰ سے تمہارے کام بنوا سکتے ہیں، حالانکہ تمام ملائکہ مقربین مل کر بھی اللہ سے اپنی کوئی بات نہیں منوا سکتے۔ اِس طرح کے عقائد جو تم نے اختیار کر رکھے ہیں، ان میں سے کوئی عقیدہ بھی کسی علم اور دلیل پر مبنی نہیں ہے، بلکہ کچھ خواہشات ہیں جن کی خاطر تم بعض اوہام کو حقیقت سمجھ بیٹھے ہو۔ یہ ایک بہت بڑی بنیادی غلطی ہے جس میں تم لوگ مبتلا ہو۔ دین وہی صحیح ہے جو حقیقت کے مطابق ہو، اور حقیقت لوگوں کی خواہشات کے تابع نہیں ہے کہ جسے

وہ حقیقت سمجھ بیٹھیں وہی حقیقت ہو جائے۔ اُس سے مطابقت کے لیے قیاس و گمان کام نہیں دیتا، بلکہ اس کے لیے علم درکار ہے۔ وہ علم تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو تم اس سے منہ موڑتے ہو اور الٹا اُس شخص کو گمراہ ٹھیراتے ہو جو تمہیں صحیح بات بتا رہا ہے۔ اِس غلطی میں تمہارے مبتلا ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ تمہیں آخرت کی کوئی فکر نہیں ہے۔ بس دنیا ہی تمہاری مطلوب بنی ہوئی ہے۔ اس لیے نہ تمہیں علمِ حقیقت کی کوئی طلب ہے، نہ اِس بات کی کوئی پروا کہ جن عقائد کی تم پیروی کر رہے ہو وہ حق کے مطابق ہیں یا نہیں۔

ثانیاً لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ ہی ساری کائنات کا مالک و مختار ہے۔ راست رو وہ ہے جو اس کے راستے پر ہو، اور گمراہ وہ جو اس کی راہ سے ہٹا ہوا ہو۔ گمراہ کی گمراہی اور راست رو کی راست روی اُس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ ہر ایک کے عمل کو وہ جانتا ہے اور اس کے ہاں لازماً برائی کا بدلہ بُرا اور بھلائی کا بدلہ بھلا مل کر رہنا ہے۔ اصل فیصلہ اس پر نہیں ہونا کہ تم اپنے زعم میں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو اور اپنی زبان سے اپنی پاکیزگی کے کتنے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہو۔ بلکہ فیصلہ اس پر ہونا ہے کہ خدا کے علم میں تم متقی ہو یا نہیں۔ اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرو تو اُس کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ چھوٹے چھوٹے قصوروں سے وہ درگزر فرمائے گا۔

ثالثاً، دینِ حق کے وہ چند بنیادی امور لوگوں کے سامنے پیش کیے گئے ہیں جو قرآن مجید کے نزول سے صدہا برس پہلے حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کے صحیفوں میں بیان ہو چکے تھے، تاکہ لوگ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیا اور نرالا دین لے آئے ہیں، بلکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ یہ وہ اصولی حقائق ہیں جو ہمیشہ سے خدا کے نبی بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ اس کے ساتھ انہی صحیفوں سے یہ بات بھی نقل کر دی گئی ہے کہ عاد اور ثمود اور قومِ نوح اور قومِ لُوط کی تباہی اتفاقی حوادث کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُسی ظلم و طغیان کی پاداش میں اُن کو ہلاک کیا تھا جس سے باز آنے پر کفارِ مکہ کسی طرح

آمادہ نہیں ہو رہے ہیں۔

یہ مضامین ارشاد فرمانے کے بعد تقریر کا خاتمہ اس بات پر کیا گیا ہے کہ فیصلے کی گھڑی قریب آ لگی ہے جسے کوئی ٹالنے والا نہیں ہے۔ اُس گھڑی کے آنے سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ مجید کے ذریعہ سے تم لوگوں کو اسی طرح خبردار کیا جا رہا ہے جس طرح پہلے لوگوں کو خبردار کیا گیا تھا۔ اب کیا یہی وہ بات ہے جو تمہیں انوکھی لگتی ہے؟ جس کی تم ہنسی اڑاتے ہو؟ جسے تم سننا نہیں چاہتے اور شور مچاتے ہو تاکہ کوئی اور بھی اسے نہ سننے پائے؟ اپنی اس نادانی پر تمہیں رونا نہیں آتا؟ باز آ جاؤ اپنی اس روش سے، جھک جاؤ اللہ کے سامنے اور اسی کی بندگی کرو۔

یہی وہ مؤثر خاتمۂ کلام تھا جسے سُن کر کٹے سے کٹے منکرین بھی ضبط نہ کر سکے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کلامِ الٰہی کے یہ فقرے ادا کر کے سجدہ کیا تو وہ بھی بے اختیار سجدے میں گر گئے۔

الاخوان المسلمون

تاریخ — دعوت — خدمات

خلیل حامدی

(۳)

چوتھا مرحلہ ۱۹۴۹ء — ۱۹۵۴ء

آزمائش میں کمی اور نئے مرشد کا انتخاب حالات نے پھر پلٹا کھایا۔ سات ماہ بعد ۲۵ جولائی ۱۹۴۹ء کو ابراہیم عبدالہادی پاشا گدی سے اترنے پر مجبور کر دیا گیا۔ حسین سری پاشا نے مخلوط وزارت بنائی جس کا کام انتخابات کی نگرانی تھی۔ اخوان کو قدرے اطمینان کا سانس نصیب ہوا۔ انتخابات میں وفد پارٹی غالب اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ اس کامیابی میں اخوان کی تائید کو بھی دخل تھا۔ ۱۲ فروری ۱۹۵۰ء کو نحاس پاشا نے زمام حکومت ہاتھ میں لی۔ اخوان کو جزوی طور پر آزادی نصیب ہوئی۔ جن کے بارے میں سمجھ لیا گیا تھا کہ اب ان کی داستان تک باقی نہ رہے گی وہ دامن جھاڑ کر پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے قلم حرکت میں آگئے اور ان کے اخبارات از سر نو جلوہ بار ہوگئے۔ حسن بن اسماعیل الہُضیبی ان کے نئے مرشد عام منتخب ہوئے۔ اس سے پہلے وہ سپریم کورٹ میں لیگل ایڈوائزر تھے۔ الاخوان المسلمون اپنے نئے مُرشد کی قیادت میں اپنے مختلف شعبوں کی جدید تنظیم اور استحکام میں لگ گئی۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۵۰ء کو حکومت نے اخوان کی بعض املاک کو بحال کر دیا۔ یہ فیصلہ کونسل آف اسٹیٹ کے ایک حکم کی بنا پر ہوا جس میں کونسل آف اسٹیٹ نے کہا: "الاخوان المسلمون کو خلافِ قانون قرار دینے کا فیصلہ سراسر غلط تھا۔ یہ فیصلہ مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے اختیارات میں نہ تھا۔ اخوان نے پلک جھپکتے اپنے حالات کو درست کر لیا۔ اور پھر تاریخ کے اسٹیج پر آبیٹھے اور قابلِ لحاظ قوت بن گئے۔

محلاتی سازشوں کا آغاز | اکتوبر ۱۹۵۱ء تک مصطفیٰ نحاس پاشا کی حکومت رہی۔ پھر نحاس پاشا کی برطرفی کے بعد قصر عابدین اور انگریز کی ملی بھگت نے "محلاتی سازشوں" کو جنم دیا اور ۹ ماہ کے اندر چار مرتبہ وزارتیں تبدیل ہوئیں۔ عوام انگریز کے غیر مشروط انخلاء کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ مطالبہ روز بروز شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ برطانوی فوج غیر مشروط تو کیا مشروط طور پر بھی نکلنے کے لیے تیار نہ تھی۔ قصر، عوام اور برطانوی فوج کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا۔ جو وزارت قائم ہوتی وہ عوامی مطالبے کے سامنے جھکتی تو قصر اُسے برطانوی ٹینکوں کے بل بوتے پر اُلٹ دیتا اور اگر قصر کی خواہش پوری کرتی تو عوامی مظاہرے اور اضطرابات اُس کے لیے پیغامِ اجل بن جاتے۔ اسی ادھیڑ بُن میں ۲۳ تا ۲۶ مئی ۵۲ء کو ملک کے اندر فوج نے انقلاب برپا کر دیا اور ملک کی تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

معاہدۂ برطانیہ کی تنسیخ کا اعلان | اکتوبر ۱۹۵۱ء تک مصطفیٰ نحاس پاشا کی حکومت قائم رہی۔ نحاس پاشا کے اس دورِ وزارت کا زریں کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عوامی مطالبہ کی تائید میں پارلیمنٹ کے ذریعہ اُس معاہدے کی تنسیخ کا اعلان کر دیا جو ۱۹۳۶ء میں مصر اور برطانیہ کے درمیان طے پایا تھا جس کی بنا پر مصر برطانیہ کی فوجی چھاؤنی بنا ہوا تھا، اور سویز پر برطانیہ اور فرانس نے مشترکہ اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ نحاس پاشا نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا: "۱۹۳۶ء میں خود مصر نے برطانیہ سے یہ معاہدہ کیا تھا اور آج مصر ہی اس کی تنسیخ کا اعلان کرتا ہے۔" اس اعلان نے عوام کے مُردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ مگر قصر اور برطانوی فوج کے اندر سراسیمگی پھیل گئی۔

معرکۂ آزادی میں اخوان کا حصہ | نحاس پاشا نے برطانوی قیادت سے گفت و شنید کرنی چاہی تا کہ فوجوں کے انخلاء کی تاریخ مقرر کی جائے، مگر برطانوی قیادت طرح دے کر اسے ٹالتی رہی۔ عوام بے قابو ہو گئے اور "جنگ آزادی" کا افتتاح ہو گیا۔ نحاس حکومت بھی عوام کے ساتھ تھی۔ وطنِ عزیز کی آزادی کی خاطر مجاہدین اُٹھ کھڑے ہوتے، سویز کا علاقہ میدانِ جنگ بن گیا، اخوان المسلمون کے رضا کاروں نے اس جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بہادری اور جاں نثاری کے حیرت انگیز کرشمے دکھائے۔ اخوان نے کالجوں کے اندر عسکری تربیت کے کیمپ کھول دیئے اور تمام پارٹیوں کے طلبہ بلا استثناء اخوان کے

زیراہتمام عسکری تربیت لینے لگے ۔انگریزی فوج کے حواس باختہ ہوگئے یہاں تک کہ انگریزی فوج کی کمان فاید ریڈیو اسٹیشن سے مسلسل یہ اعلان نشر کرتی رہی کہ جو شخص شیخ محمد فرغلی کا سر قلم کرکے لائے گا اُسے ۵ ہزار پونڈ انعام دیا جائے گا۔شیخ فرغلی اخوان کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔اس جنگ میں انہوں نے گوریلا دستوں کی مدد سے انگریزی فوجوں کے چھکے چھڑا دیئے۔(جمال عبدالناصر نے ۵۴ء کے اواخر میں اخوان کے جن رہنماؤں کو پھانسی کی سزا دی اُن میں سے ایک شیخ محمد فرغلی بھی تھے)۔وفد گورنمنٹ اخوان مجاہدین کی شجاعت، تدبیر، قربانی اور جذبۂ جہاد سے اس قدر متأثر ہوئی کہ اُس نے اخوان رہنماؤں کو بلا کر اس امر پر تبادلۂ خیال کیا کہ جنگ کی کمان کلیتہً اخوان رضاکاروں کے سپرد کردی جائے۔مگر اس تجویز کے اگلے ہی روز قصر نے وفد گورنمنٹ کو توڑ دیا۔

وفد گورنمنٹ کے ساتھ اخوان کا یہ معاہدہ ہوچکا تھا کہ حکومت اخوان کی سیاسی سرگرمیوں پر قدغن عائد نہیں کرے گی۔حالانکہ اس سے پہلے بھی حکومت کوشش کرچکی تھی کہ اخوان سیاسیات میں حصّہ نہ لیں اور وزیر داخلہ فؤاد سراج الدین (جو وفد کے جنرل سکرٹری بھی تھے)، پارلیمنٹ سے بھی ۵۰ء میں قانون پاس کرواچکے تھے۔مگر اخوان نے یہ قانون تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔اور بالآخر وفد گورنمنٹ کو خود ہی جھکنا پڑا۔

وفد گورنمنٹ کو ختم کرنے کا مقصد آزادی کی تحریک کو دبانا تھا۔علی ماہر کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی۔مگر یہ وزارت بھی چند روز کی مہمان رہی۔علی ماہر کے بعد نجیب ہلالی لائے گئے۔وہ بھی زیادہ عرصہ نہ ٹھیر سکے۔ ان دونوں نے سابقہ حکمرانوں کے برعکس نئی طرح ڈالی۔یہ اخوان المسلمون اور دیگر سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں سے ملتے اور اُن سے مشورہ کرتے۔نجیب ہلالی کے دَورِ وزارت میں اخوان نے حالات کے عدم استقرار کی وجہ سے عارضی طور پر یہ اعلان کیا کہ وہ انتخابات میں حصّہ نہیں لیں گے۔نجیب ہلالی کے بعد حسین سری اور پھر دوبارہ نجیب ہلالی آئے۔ان سب وزارتوں کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی۔بپھرے ہوئے عوام کو طفل تسلیوں میں مبتلا کرنا مقصود تھا۔

اخوان اور انقلاب مصر: جولائی ۵۲ء میں مصر کی سرزمین نے ایک اور انقلاب دیکھا شاہ مصر فاروق

سے قدرت نے انتقام لیا۔ اور آن کی آن میں اس کا فرعونی جاہ و حشم داستانِ پارینہ بن گیا۔ یہ انقلاب کیسے برپا ہوا اور اس کی کامیابی کے اسباب کیا ہیں اور اس کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟ ان سب سوالات کا جائزہ لیے بغیر بعد کے حالات کو سمجھنا ناممکن ہے۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ مختصراً ان سوالات پر روشنی ڈال دی جائے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں انگریزی استعمار نے مصر کے اندر اپنا نفوذ پیدا کرنا شروع کیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے خدیو مصر کو اپنی جھولی میں ڈال لیا۔ احمد عرابی پاشا اور مصطفیٰ کامل جیسے محبانِ وطن نے اس نفوذ کو روکنے کی کوشش کی۔ مگر یہ طوفان روز بروز تیز ہوتا گیا۔ حریت پسندوں نے یکے بعد دیگرے کئی تنظیمیں قائم کیں مگر کسی کی بن نہ آئی۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۴ء کو باقاعدہ مصر پر "برطانوی تولیت" کا اعلان کر دیا گیا۔ مصری قوم اس تولیت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ ۲۸ فروری ۱۹۲۲ء کو برطانیہ اپنی "تولیت" کو ختم کرنے پر مجبور ہوا مگر اس کے ساتھ ہی "تحفظات" کی ایسی زنجیریں مصر کے پاؤں میں ڈال دی گئیں کہ بظاہر اگرچہ برطانیہ کی تولیت ختم ہو چکی تھی مگر "مصر کے دفاع"، "غیر ملکیوں کے تحفظ" اور اس جیسے دوسرے عنوانات کے پردے میں یہ دیوِ استبداد برابر رقص کناں رہا۔ ۱۹ اپریل ۱۹۲۳ء کو مصر میں پہلی مرتبہ دستور کا نفاذ ہوا اور مصر کو خود مختار ریاست کی حیثیت دی گئی اور اسلام کو اس کا مذہب قرار دیا گیا۔ مگر استعمار کو جو ملک کے اندر دخیل ہو رہا تھا مصر کی یہ روش کہاں پسند تھی۔ چنانچہ ۲۶ اگست ۱۹۳۶ء کو مصر اور برطانیہ کے مابین ایک معاہدہ وجود میں آیا جس کا نام تھا "دوستی اور رفاقت کا معاہدہ"۔ اس معاہدہ کی رُو سے مصر نے برطانیہ کو یہ "رخصت" دے دی کہ وہ "سویز کے آس پاس انگریزی فوجوں کی چھاؤنی قائم کر سکتا ہے جو سویز کے تحفظ کی ضامن ہوں گی"۔ اس طرح سے انگریز باقاعدہ جنگی قوت کے ساتھ مصر کے اندر اُتر آیا اور مصر کی بدقسمتی کا دن طلوع ہو گیا۔ اس کے بعد مصر میں دستوری حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور انگریز اور شاہ مصر اور ان کی کٹھ پتلی وزارتیں ملک پر مسلط ہو گئیں۔ سویز کے "تحفظ" کو انگریزی فوجوں نے ہاتھ میں لے کر گویا مصر کی اقتصادی شاہ رگ ہاتھ میں لے لی اور جوں جوں انگریز کا نفوذ بڑھتا گیا اور مصر کی بے بسی میں اضافہ ہوتا گیا، انگریز مصر کے پورے نظام پر غالب ہوتا گیا۔

نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مصر کے اقتصادی نظام تعلیمی اور ثقافتی نظام اور داخلی اور خارجی سیاست کی رگوں میں انگریزی ڈپلومیسی کا خون جاری وساری ہو گیا۔ مدرسوں اور کالجوں کی اکثریت عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی، معلّمین اور معلّمات عیسائی تھے، تجارت پر یورپی کمپنیوں کا قبضہ تھا اور مصری قوم ان کے مظالم کی چکی میں بُری طرح پس رہی تھی۔ شاہ فواد الاوّل کے دَور میں تو مصری عوام کو کچھ نہ کچھ بولنے کی آزادی تھی مگر فاروق کا دورِ اقتدار مصری عوام کے لیے دوہری غلامی کا دَور تھا۔ ایک انگریزوں کا تسلط اور دوسرا فاروق کا استبداد۔

حسن البنّاء نے اخوان المسلمون کی تاسیس کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مصر کی پژمردہ اور مایوس قوم کے اندر جہاد کا جذبہ پھونکا۔ جہاد کے موضوع پر اُن کا مشہور رسالہ اخوان کے ابتدائی دَور کی آواز ہے۔ اس رسالہ میں امام البنّا نے بڑی بلاغت اور جامعیت کے ساتھ مصری عوام کو اُس نسخے کی طرف توجہ دلائی ہے جو مسلمان قوموں کی پستی اور انحطاط کا اصل علاج ہے۔ امام بنّا نے اس رسالے میں پہلے قرآن کی ان تمام آیات کو پیش کیا ہے جن میں جہاد کی فرضیت کا واضح حکم موجود ہے۔ اس کے بعد احادیثِ نبویہ سے بہ تفصیل استشہاد کیا ہے۔ ان کے رسالہ کا اہم باب وہ ہے جس میں انہوں نے جہاد کے بارے میں امتِ اسلامی کے تمام فقہاء کے احکام بیان کیے ہیں۔ ابنِ قدامہ صاحب المغنی کی رائے بیان کی ہے کہ "جب کسی شہر کے اندر کفار اُتر آئیں تو اس کے باشندوں پر یہ فرض عین ہو جاتا ہے کہ وہ اُن سے قتال کریں اور شہر سے اُن کو نکالیں۔" ازہر کے گوشوں میں بیٹھنے والے علماء کو جھنجوڑتے ہوئے کہا ہے کہ امام بدرالدین عینی شارح بخاری سے کون بڑا عالم ہو سکتا ہے۔ ان کا معمول تھا کہ ایک سال وہ جہاد کرتے، ایک سال تعلیم و تدریس میں مصروف رہتے اور ایک سال حج میں گزارتے۔" آخر میں ان لوگوں کی بھی سرزنش کی ہے جو قتال کو جہاد اصغر اور جہاد نفس کو جہاد اکبر قرار دے کر اصلاح نفس کی آڑ میں لوگوں کو پست حوصلہ کر رہے تھے لکھتے ہیں:" بعض لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ عامۃ الناس کو قتال کی اہمیت اور جہاد کی تیاری سے رُوک دیں۔ وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حدیث میں وارد ہے کہ جہاد اکبر یہ ہے کہ انسان اپنے نفس سے مجاہدہ کرے۔ یہ دلیل بے بنیاد ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب تسدید القوس میں لکھا ہے کہ یہ قول عام زبانوں پر جاری ہے مگر یہ رسول کا قول نہیں ہے بلکہ ابراہیم بن عبلہ راوی کا کلام ہے۔"

چنانچہ اخوان المسلمون نے اپنے بنیادی مقاصد میں سے یہ قرار دیا کہ "والموتُ فی سبیل اللہ اسمیٰ امانینا" (اللہ کی راہ میں شہادت ہماری بلند ترین تمنا ہے)۔ یہ صرف ان کا زبانی نعرہ نہیں تھا بلکہ عملاً بھی انہوں نے اپنے ارکان کو جہاد کی تربیت دینا شروع کر دی۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نوجوان فضول کاموں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے فوجی تربیت حاصل کرتے اور جہاد کی رُوح قوم کے اندر پھونکتے۔ اس جذبۂ جہاد کا صحیح مظاہرہ اس وقت ہوا جب ۴۸ء میں یہودیوں کے خلاف عرب عوام نے جنگ برپا کر دی۔ انورالسادات نے (جو جمال عبدالناصر کے دست راست اور موجودہ نائب صدر جمہوریہ ہیں) اپنی ڈائری "صفحات مجہولہ" ص ۷۷ پر لکھا ہے:

"ان دنوں (یعنی ۴۸ء کی جنگِ فلسطین میں) جہاد و قتال کے لیے سب جماعتوں سے بڑھ کر جو جماعت بے تابی کا اظہار کر رہی تھی وہ الاخوان المسلمون تھی۔ . . . جس شام فلسطین کو روانگی تھی، حسن البنا اور شیخ فرغلی آئے، اور مجاہدین کے دستوں سے خطاب کیا اور اُن میں بڑا جوش و خروش پیدا کر دیا۔"

رُوحِ جہاد پھونکنے کے ساتھ اخوان المسلمون نے دوسرا بڑا کام یہ کیا کہ ملک کے اندر اسلامی حکومت کے قیام کا مطالبہ اٹھا دیا۔ ۱۹۴۸ء میں حسن البنا نے وزیر قانون احمد خشبہ پاشا کو طویل مکتوب لکھا جس میں مطالبہ کیا کہ "پچاس سال سے غیر اسلامی قوانین آزمائے جا رہے ہیں اور وہ سخت ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ اب اسلامی شریعت کا تجربہ کیا جانا چاہیے۔" اس مکتوب میں امام حسن البنا نے پہلے اسلامی قانون کی اہمیت کتاب اللہ کی رُو سے بیان کی ہے۔ اور پھر بتایا ہے کہ اگر اپنے ملک (مصر) کے دستور اور قانون پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا ماخذ اور سرچشمہ کتاب و سنت نہیں بلکہ یورپ کے ممالک: بلجیم، فرانس، اٹلی وغیرہ کے دساتیر و قوانین ہیں۔ ہمارا دستور کلیات کے اعتبار سے بھی اور جزئیات کے لحاظ سے بھی اسلام سے صریح طور پر متصادم ہے۔ اب غور کیجیے کہ اگر ایک مسلمان کے سامنے ایسا معاملہ آتا ہے جس کا فیصلہ اسلام کی رُو سے کچھ ہے، اور موجودہ قانون کی رُو سے کچھ اور، تو اس وقت وہ مسلمان کونسا موقف اختیار کریگا۔

پھر غور کیجیے کہ اس ملک کے مجسٹریٹ، جج، چیف جسٹس اور وزیرِ قانون کے لیے احکم الحاکمین کے احکام کی مخالفت کیسے جائز اور حلال ہوگی ؟"

اس زبردست تنقید کے بعد امام حسن البنّاؒ نے اُن لوگوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے جو عصرِ حاضر میں اسلامی قانون کے نفاذ کو ناممکن خیال کرتے ہیں۔ اور آخر میں اس مطالبے پر مکتوب کو ختم کیا ہے کہ :

"الاخوان المسلمون کا مطالبہ یہ ہے کہ ہماری حکومت شریعت اسلامیہ کی طرف لوٹے۔ اور مصری قانون کے نظام کو فوراً شریعت کی بنیادوں پر اُستوار کرے ہم ایک مسلم قوم ہیں، ہم نے عزم کر لیا ہے کہ ہم صرف اللہ کے قانون اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی حکمرانی اور بالادستی تسلیم کریں گے، خواہ ہمیں اس کی بھاری سے بھاری قیمت ادا کرنی پڑے اور بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنی پڑے۔ ایک آزاد اور خودمختار مسلمان قوم ہونے کی حیثیت سے یہ ہمارا فطری حق ہے اور سیاسی و اجتماعی شوکت و استقلال کا کوئی دوسرا مظہر اس کا بدل اور قائمقام نہیں ہو سکتا۔ آپ بھی اس حق کے حصول میں ہماری مدد کیجیے۔ اس صورتِ حال کو بدلنے کی کوشش کیجیے اور قوم کو مجبور نہ کیجیے کہ وہ کسی ایسے راستے پر پڑ جائے جس پر مایوسی اور اضطرار کی حالت میں عموماً قومیں پڑ جایا کرتی ہیں"

ایک طرف الاخوان کا یہ مطالبہ تھا، اور دوسری طرف مصر میں بادشاہت کا کوس لمن الملک بج رہا تھا۔ خدیو توفیق پاشا نے عرابی پاشا کو کہا تھا کہ "یہ ملک مجھے اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملا ہے"۔ یہی تصور توفیق پاشا کے جانشینوں کے دماغ میں رچا بسا ہوا تھا۔ تاہم فواد الاول (متوفی ۱۹۳۶ء) کا عہد بسا غنیمت تھا مگر فاروق کا عہد سیاسی ابتری اور انگریزوں کی دراندازی کی وجہ سے تاریک ترین عہد تھا۔ اس دور میں حسن البنّا وہ واحد شخصیت تھے جو دربارِ شاہی سے کنارہ کش رہے۔ ورنہ یہ وہ حمام تھا جس میں نحاس پاشا جیسے حُر، طٰہٰ حسین جیسے آزاد خیال، احمد حسن زیات

جیسے صاحب طرز ادیب، اور محمد حامد فقی مرحوم جیسے سنت کے علمبردار سب ننگے نظر آتے ہیں۔ خود فاروق بھی حسن البنا سے سخت نفرت کرتا تھا۔ شروع شروع میں تو وہ اخوان کی تحریک کو خاطر میں نہیں لاتا تھا مگر جوں جوں اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ زور پکڑتا گیا اُس کی آنکھیں کھلتی گئیں۔ انور السادات نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ ۱۹۴۴ء میں اُس نے (یعنی انور السادات نے) حسن البنا سے ملاقات کی۔ اُس وقت حسن البنا شاہ فاروق کی طرف سے کچھ متفکر سے تھے۔ کہنے لگے:

"شاہ الاخوان کی دعوت سے شدید خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ اُس کے کانوں تک یہ بات پہنچ چکی ہے کہ الاخوان کی دعوت کی بنیاد یہ ہے کہ حکمران عوام کی مرضی اور بیعت سے مقرر ہونا چاہیے۔ موروثی بادشاہت کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے .... چنانچہ شاہ سوچ رہا ہے کہ کس طرح الاخوان پر ہاتھ ڈالا جائے۔" (صفحات مجہولہ ص ۹۹)

الاخوان اور فاروق کی کشمکش اس حد تک بڑھی کہ بالآخر فاروق اور عبدالہادی پاشا نے مل کر امام حسن البنا کو شہید کروا دیا۔ اور بعد کی عدالتی تحقیقات سے یہ ثابت ہو گیا کہ قاتلین میں فاروق کا خادمِ خاص بھی شامل تھا۔ بہر حال اخوان کی تحریک نے مصری عوام کے دلوں میں اچھی طرح یہ حقیقت اُتار دی تھی کہ جب تک ملک کے اندر سے بادشاہت کی بساط نہیں لپٹ جاتی یہاں کوئی اصلاح کارگر نہیں ہو سکتی۔ اور پھر بادشاہت کا خاتمہ اصل مقصود نہیں۔ بلکہ اسلامی حکومت کا قیام اصل چیز ہے۔ فاروق کے استبداد، اُس کی اخلاقی انارکی، انگریزوں سے اُس کے گٹھ جوڑ اور فلاحین پر اُس کے کارندوں کے بے پناہ مظالم اخوان کی دعوت میں جادو کا اثر ڈال رہے تھے۔ اور ایک وقت وہ آگیا کہ مصر کا بچہ بچہ فاروق سے بیزار ہو گیا۔

فاروق کے عہد میں جو وزارتیں قائم ہوتی رہیں وہ دو حالات سے خالی نہ ہوتی تھیں۔ یا تو وہ فاروق کی مرضی سے قائم ہوتی تھیں اور ان کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہ ہوتی تھی، اور یا اُن کی پشت پر انگریزی فوج ہوتی تھی۔ چنانچہ فروری ۱۹۴۲ء میں وفد پارٹی کی حکومت برطانوی ٹینکوں کی بدولت قائم ہوئی تھی (ملاحظہ ہو کتاب: فاروق بین القمۃ والحضیض ص ۳۷)۔ چنانچہ الاخوان نے ان تمام حکومتوں

سے اپنی بیزاری اور عدم تائید کا اعلان کر دیا تھا اور عوام الناس کے سامنے ان کی اصل حقیقت کو منکشف کر دیا تھا۔

اس کہانی کا چوتھا کردار مصری فوج ہے مصری فوج بلاشبہ اُس وقت عرب ممالک کی افواج میں سب سے مضبوط اور تربیت یافتہ فوج سمجھی جاتی تھی۔ مگر انگریزی فوج کے وجود نے اُسے بے بس کر رکھا تھا۔ مصری فوج کے افسروں کی اکثریت شاہ پرستی کی بیماری میں مبتلا تھی۔ اور صرف محدود عنصر ایسا تھا جو حالات کی سنگینی اور ابتری پر خون کے آنسو بہا تا رہتا تھا۔ لیکن ملک کے اندر اصلاحی کام کرنے کے لیے ضروری تھا کہ جس عنصر کے ہاتھ میں ملک کی اصل طاقت ہے خود اُس کے ذہن وفکر کی دنیا میں تبدیلی ہو۔ مصر کا موجودہ نائب صدر انور السادات اُن پہلے فوجی افسروں میں سے ہے جو حسن البنّا کی دعوت سے واقف ہوئے۔ چنانچہ انور السادات اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ حسن البنّا سے متعدد فوجی افسر آکر ملتے۔ حسن البنّا کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی طرح مصری فوج کے افسروں میں دینداری پیدا ہو"۔ (صفحات مجہولہ ص ۲۴۹)

حسن البنّا کی موہوب شخصیت اور اُن کی ربّانی دعوت کی یہ معجزانہ تاثیر تھی کہ مصری جیش کے اندر اُسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ انور السادات لکھتا ہے کہ " اہلِ وطن انگریزی نفوذ سے ہر قیمت پر جان چھڑانا چاہتے تھے۔ اسی جذبے کے تحت مصری فوج کے حریت پسند افسروں کے گروپ اور حسن البنّا کے درمیان ربط ضبط پیدا ہوا"۔ (ایضاً ص ۲۴۹) اور یہ ربط یہاں تک بڑھا کہ مصری فوج کا ایک گروہ اخوان کو مصر کی نجات کی واحد امید سمجھتا تھا"۔ (ایضاً ص ۱۵۶)

اس طرح سے اخوان نے ہر محاذ پر انگریزوں کے تسلط اور بادشاہت کے استبداد سے مصری قوم کو نجات دلانے کے لیے زمین ہموار کی۔ اور بالآخر جولائی ۵۲ء کو وہ انقلاب برپا ہوا جس کے بعد مصر سے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس انقلاب کی کامیابی صرف فوج کے سر نہیں ہے۔ مصری فوج کے اندر اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ کوئی ایسا اقدام کرتی جس میں اُس کا تین سخت جان حریفوں سے پالا پڑنے والا تھا۔ ایک انگریزی فوج، دوسرے فاروق اور تیسرے مصر کے طالع آزما سیاست دانوں کی حکومت۔ بے شک انقلاب کی پہلی توپ فوج نے چلائی لیکن انگریزی تسلط اور فاروق کے خلاف اخوان مصری قوم

کے اندر بیزاری کے بیج اس قدر بو چکے تھے کہ انقلاب کی توپ سنتے ہی پوری قوم نے اس پر خیر مقدم کے پھول نچھاور کیے ۔ بقول جنرل نجیب :

"انقلاب کے بعد عرصہ دراز تک الاخوان اور انقلابی کونسل میں خاصا تعاون رہا۔ امام حسن البنا کے قاتل گرفتار کیے گئے ۔ اخوان کے سیاسی قیدیوں کو رہا گیا۔ اخوان بھی انقلابیوں کی تائید میں کم نہیں تھے ——— بلکہ ایک گروہ ان کی تائید میں آتنا آگے تھا کہ اخوان کے بہت سے خیر اندیشوں کو یہ روش بُری طرح کھٹکی ۔ اور یہی وجہ ہے کہ حسن الہضیبی اور دوسرے تیز رو نوجوانوں کے درمیان اس مسئلے پر کچھ اختلاف بھی ہوا ۔

اخوان اور انقلابی کونسل میں اختلافات آخر کار اخوان اور انقلابی حکومت کے درمیان اختلافات نے سر اٹھا لیا جو کم ہونے کے بجائے بڑھتے گئے اور نوبت تاریخ کی زبردست ٹریجڈی تک پہنچ گئی ۔ ان اختلافات کی ترتیب اور خلاصہ یہ ہے :

۱ - اختلاف کا پہلا موقع انقلابی وزارت کی تشکیل کے وقت پیش آیا ۔ ۹ ستمبر ۱۹۵۲ء کو انقلابی کونسل نے علی ماہر کو (جو انقلاب کے بعد وزیر اعظم بنائے گئے تھے) برطرف کر دیا اور محمد نجیب نے وزارت کی تشکیل کی ۔ انقلابی کونسل نے اخوان کو تین وزیروں کے اشتراک کی پیش کش کی ۔ مکتب الارشاد (اخوان کی مجلس شوریٰ) نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا ۔ حسن الہضیبی جماعت کو ایسی حکومت میں شامل کرنے کے لیے تیار نہ تھے جس میں اصل اختیارات حکومت کو نہیں بلکہ انقلابی قیادت کو حاصل ہوں ۔ حسن الہضیبی نے کہا کہ "ہم حکومت کے بے لوث خیر خواہ ہیں ، اربابِ اقتدار اچھا کام کریں گے تو ہماری تائید ہو گی ——— اور ان سے غلطیاں ہوں گی تو ہم اس پر ٹوکیں گے "۔ مکتب الارشاد کے ایک رکن احمد حسن باقوری نے جماعت کے فیصلے کے خلاف وزارت قبول کر لی اور انہیں جماعت سے مستعفی ہونا پڑا ۔

۲ - اخوان نے اسلامی نظام کے احیاء کا مطالبہ دہرانا شروع کر دیا ۔ المسلمون (اگست ۱۹۵۲ء) نے "انقلاب" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "جہاں تک قوم کو استعمار اور استبداد سے نجات دلانے کا تعلق ہے وہ انقلاب نے پورا کر دیا ہے ۔ لیکن اصل کام ایک ایسی نسل کی تیاری ہے جو عقل و فکر کے لحاظ سے ،

جذبات و احساسات کے لحاظ سے اور اخلاق و اعمال کے لحاظ سے پوری مسلمان ہو جس پر احکام اسلامی کی تنفیذ کے لیے بھروسہ کیا جا سکے ۔ یہ کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اسلام کا صحیح فہم رکھتے ہیں، اور حق و باطل کے معرکے میں جن کے قدم کسی حال میں بھی نہیں ڈگمگا سکتے ۔" اخوان نے انقلابی کونسل سے مطالبہ کیا کہ ملک کے اندر شراب نوشی اور قمار بازی کو ممنوع قرار دیا جائے ۔ لیکن کونسل نے صرف چند جزوی پابندیاں تجویز کیں جن سے اخوان راضی نہ ہوئے (محمد نجیب: "مصر کا انجام" ص ۱۵۶)

۳- ۱۰ دسمبر کو مصر کا دستور منسوخ قرار دے دیا گیا اور نئے دستور کے لیے سو ممبروں کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ حسن الھضیبی نے ملک کے رجحانات دیکھ کر مطالبہ کیا کہ اس امر پر استصواب عام کرایا جائے کہ آیا مصر کو اسلامی شریعت چاہیے یا مغربی قانون"۔ یہ مطالبہ انقلابی کونسل کو ناگوار گزرا۔

۴- ۱۶ جنوری ۱۹۵۳ء کو انقلابی کونسل نے ایک قانون کے ذریعہ تمام سیاسی پارٹیوں کو ختم کر دیا۔ اس موقع پر حسن الھضیبی کی تجربہ کاری اور دور بینی کام آئی۔ پرجوش اخوانی فوج کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر حسن الھضیبی نے اپنا تشخص الگ قائم رکھنا ضروری سمجھا خواہ اس کے نتیجے میں چھوٹی موٹی سیاسی دلچسپیوں سے کنارہ کش ہونا پڑے۔ چنانچہ انہوں نے انقلابی کونسل کو ایک یادداشت بھیجی جس میں الاخوان کو مروجہ سیاسی پارٹیوں کی صف میں شمار کرنے پر اعتراض کیا اور بتایا کہ "الاخوان ایک ہمہ گیر دینی جماعت ہے۔ سیاست اس کے کام کا صرف ایک جز ہے۔ اخوان حکومت کے طالب نہیں ہیں۔ اور نہ وہ پارلیمنٹ کے انتخاب میں حصہ لیں گے"۔ اس طرح مرشد نے جماعت کو سخت حادثے سے بچا لیا۔"

۵- ۲۳ جنوری ۱۹۵۳ء کو سرکاری پارٹی "ہیئۃ التحریر" کے قیام کا اعلان کیا گیا اور اخوان اور دوسری سیاسی پارٹیوں کے کارکنوں کو اس میں مدغم ہونے کی دعوت دی گئی۔ اخوان نے ادغام سے انکار کر دیا۔ حسن الھضیبیؒ نے جمال عبدالناصر سے مل کر ان پر واضح کیا کہ "انقلاب تمام قوم کی آرزوؤں کا آئینہ دار ہے اس لیے اس کو کسی خاص پارٹی سے منسوب نہ کرنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہو گا کہ طالع آزما اور ابن الوقت لوگ اس نئی تنظیم میں داخل ہو کر اسے ذاتی اغراض کے لیے استعمال کریں گے۔ اور حکومت اور انقلاب کو بدنام کر دیں گے۔"

۶- ۲۲ فروری ۱۹۵۳ء سے برطانیہ کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ اخوان مذاکرات کو

سابقہ تجربات کی روشنی میں ضیاع وقت سمجھتے تھے۔ اور مزید برآں کسی ایسی شرط کو قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے جو انگریز کو کسی بھی بہانے سے دوبارہ مصر کے اندر قدم رکھنے کا موقع دیتی ہو۔

۷۔ شرائطِ معاہدہ کے بارے میں مذاکرات ہو رہے تھے کہ مسٹر ایونز انگریزی سفارت خانہ کے عہدیدار نے مرشدِ عام حسن الہضیبی سے ملاقاتیں کیں تاکہ شرائط معاہدہ کے بارے میں اُسے اخوان کی رائے معلوم ہو۔ اس کا مسٹر ایونز اور اخوان دونوں کو اقرار ہے۔ مرشد نے ان ملاقاتوں میں حکومت کے موقف کی پوری تائید کی اور فوراً ہی میجر صلاح سالم (وزیر الارشاد القومی) کو بلا کر گفتگو کی تفصیلات سُنا دیں۔ مگر اس کے باوجود انقلابی کونسل کی طرف سے اخوان پر انگریزوں سے سازباز کا الزام تھوپ دیا گیا۔

یہ تھے اخوان اور انقلابی کونسل کے درمیان اختلافات کے اصل اسباب۔ مگر ۱۲ جنوری ۱۹۵۴ء کو ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس کو بہانہ بنا کر اخوان کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ اس تاریخ کو اخوانی طلبہ یونیورسٹی کے میدان میں یوم شہداء منا رہے تھے کہ اچانک ہیئۃ التحریر کی ایک جیپ آئی، جس میں کئی مسلح آدمی سوار تھے۔ پہلے انہوں نے "اللہ اکبر اور العزۃ لمصر" کے نعرے لگائے اور جب انہیں روکا گیا تو انہوں نے ریوالوروں سے فائرنگ شروع کر دی۔ اخوان کے طلبہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس واقعہ کو بہانہ بنا کر انقلابی حکومت نے اخوان کو خلافِ قانون قرار دے دیا اور ان کے متعدد رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ اُدھر جنرل محمد نجیب کو بھی انقلابی قیادت نے برطرف کر دیا جس کی وجہ سے ملک کے اندر زبردست ہنگامے کھڑے ہو گئے۔ فوج میں بھی افراتفری برپا ہو گئی۔ انقلابی قیادت محمد نجیب کو واپس لانے پر مجبور ہوئی، بلکہ اخوان اور دوسری سیاسی پارٹیوں کی بحالی کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ اس اعلان کے تین روز بعد ہیئۃ التحریر نے جوابی ہنگامے برپا کر دیئے اور ملک کی فضا اس قدر مکدر ہو گئی کہ نجیب کو روپوش ہونا پڑا۔ اخوان کے سوا تمام سیاسی پارٹیوں کو توڑ دیا گیا اور خود جمال عبدالناصر وزارتِ عظمٰی کی گدی پر بیٹھ گئے۔

یکم ستمبر ۵۴ء کو برطانیہ سے معاہدۂ انخلاء پر دستخط ہوئے۔ اخوان نے اس معاہدہ کو مسترد کر دیا۔ اور اخوان اور انقلابی رہنماؤں کے درمیان تند و تیز بحث شروع ہو گئی۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو جمال عبدالناصر پر قاتلانہ حملہ ہوا جس کا الزام اخوان پر لگایا گیا اور اس طویل داستان کا آخری باب یوں ختم ہوا کہ اخوان کے چھ رہنماؤں کو موت کی سزا دی گئی، ہزارہا افراد کو جیلوں میں ڈال دیا گیا اور انہیں سخت تعذیب اذیت کا نشانہ بنایا گیا۔ (باقی)

افریقہ میں مسلمانوں کا حال

جناب خلیل حامدی صاحب

اس سے پہلے ان صفحات میں ہم "افریقہ میں مسلمانوں کا ماضی" پیش کر چکے ہیں جس سے قارئین کرام کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ماضی میں افریقہ کا وہ علاقہ جو اسلام اور مسلمانوں کے زیر اثر آیا تھا، جہالت و تاریکی کا پُرہول گہوارہ نہیں تھا، بلکہ تہذیب و علم کا لہلہاتا گلستان تھا۔ اسلام کی جُوئے نورانی طبعی رفتار کے ساتھ رواں دواں تھی۔ شرک و بُت پرستی کے حصار وحدانیت و خدا پرستی کی یلغار کے آگے زمیں بوس ہوتے جا رہے تھے۔ استبداد و جفا پیشگی کے بجائے مساوات و عدل گستری سایہ فگن ہو رہی تھی۔ اسلامی دعوت کی ضو پاش شعاعیں شمال سے نکل کر لگاتار جنوب کی جانب بڑھ رہی تھیں، اور جہاں جہاں بھی وہ پہنچ رہی تھیں وہاں تہذیب و شائستگی پھیل رہی تھی۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل سے جب مغربی استعمار کے منحوس قدم اس برّاعظم کی طرف بڑھنے شروع ہوئے تو کس طرح اس برّاعظم کی تہذیبی تابانی تاریکی میں بدلتی چلی گئی، اور وہاں خاص طور پر مسلمان کس ظلم و ستم اور مذہبی تعصب کے شکار بنائے گئے۔

افریقہ میں داخل ہونے کے بعد مغربی استعمار نے اُس کے مادّی وسائل پر قبضہ کر لیا اور اُن کو افریقی ممالک کی ترقی و فلاح میں صرف کرنے کے بجائے ان کا ناجائز استحصال شروع کر دیا۔ قدرتی ثروت کے وہ بے پناہ ذخیرے جن سے اس برّاعظم کا گوشہ گوشہ لبریز تھا سب کے سب ان مستعمرین کے عیش و عشرت کے لیے وقف ہو گئے۔ اور اگر ان سے افریقیوں کو کچھ استفادہ کی اجازت ملی بھی تو صرف ان لوگوں کو جو استعمار کے آلۂ کار بنے یا عیسائیت کے دائرے میں داخل ہو گئے۔

افریقہ کی جو اقوام دعوتِ اسلامی سے متأثر ہو کر دورِ تمدن میں داخل ہو رہی تھیں اور وحشت و ناشائستگی اور بادیہ نشینی کو خیرباد کہہ کر مہذب شہری زندگی کی جانب رُخ کر رہی تھیں، مغربی استعمار نے

ان کے ساتھ یہ ظلم کیا کہ انہیں مستقل طور پر جنگلوں کی مخلوق بنا دیا۔ پرتگال، اسپین، برطانیہ، فرانس اور دوسرے مغربی ملکوں نے افریقیہ کے مختلف حصوں پر تابڑ توڑ حملے کیے تاکہ انسانوں کو گرفتار کر کے غلام بنایا جا سکے، اور انہیں اپنی نئی مستعمرات کی تعمیر کے لیے بیگار کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ یہ حملے بیک وقت مغربی افریقیہ، مشرقی افریقیہ اور وسطی افریقیہ میں کیے گئے۔ انسانوں کے گروہ کے گروہ "شکار" کیے گئے۔ جو پکڑ لیے گئے انہیں جانوروں سے بھی بدتر زندگی سے سابقہ پیش آیا۔ اور جو بچ گئے وہ خوف اور دہشت کے مارے جنگلوں میں چھپ گئے۔ آج خود مغربی مؤرخین یہ اعتراف کرتے ہیں کہ مغربی قومیں اس مدت میں کم از کم دس بارہ کروڑ آدمیوں کو غلام بنا کر افریقیہ سے امریکہ اور دوسرے ملکوں میں لے گئی ہیں۔ اس ظلم و ستم کے نتیجہ میں شہری آبادیاں اجڑ گئیں، تہذیب و تمدن کی رفتار رک گئی، لاکھوں افریقی وسائلِ حیات سے دور برسوں تک صحراؤں اور غاروں میں پناہ گزین رہے، اور ان کے اندر وہ تمام خرابیاں عود کر آئیں جو محروم تہذیب اور بیگانۂ تمدن انسانوں کا خاصہ سمجھی جاتی ہیں۔ اس جرمِ عظیم کا سہرا مغربی اقوام کے سر ہے۔ اور اب افریقیہ کی تاریخی رفتار بتا رہی ہے کہ مغرب کو اس جرم کی سزا افریقیہ ہی کے ہاتھوں بھگتنی پڑے گی۔

استعمار کے داخلے کے ساتھ عیسائی مشنریوں نے بھی افریقیہ پر یلغار شروع کر دی۔ بلکہ استعمار نے اپنے قدم مضبوط کرنے کے لیے عیسائی مشنریوں ہی کو ذریعہ بنایا۔ استعماری حکومتوں نے جس ملک پر قبضہ کیا اُس کا نظام تعلیم عیسائی مشنریوں کے ہاتھ میں دے دیا تاکہ وہ تعلیم اور ثقافت کے ذریعہ افریقی اقوام کو نہ صرف عیسائی بنائیں بلکہ انہیں اپنے سفید فام آقاؤں کے نہایت وفادار غلام بنا دیں اور ان کے دل و دماغ پر استعمار کی محبت و وفاداری کو راسخ کر دیں۔ دوسری طرف ان کی یہ مستقل پالیسی تھی کہ مسلمانوں کو تعلیم سے بالکل محروم رکھا جائے، کسی شخص کو اس وقت تک تعلیم نہ دی جائے جب تک وہ عیسائی نہ ہو جائے، اور مسلمانوں کے مقابلے میں خود افریقیوں کے اندر سے ایک ایسا گروہ تیار کر دیا جائے جو مذہباً عیسائی ہو، تعلیم اور تہذیب کے اعتبار سے مسلمانوں سے فائق تر ہو، ملکی وسائل و ذرائع صرف اُس کے ہاتھ میں ہوں، اور حکومت کے نظم و نسق پر صرف اسے تصرف حاصل ہو تاکہ اس کے مقابلے میں افریقیہ کا مسلمان آئندہ کبھی سر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکے، اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی مسلمان کبھی حکمراں نہ بن سکیں۔

افریقہ کی مسلمان قوموں نے استعمار کا راستہ روکنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اِس لعنت سے افریقہ کو محفوظ رکھنے کے لیے انہوں نے قدم قدم پر اس کا مقابلہ کیا۔ مگر تاریخی عوامل استعمار کے قدم مضبوط کرتے چلے گئے۔ اسپین اور پرتگال میں اسلامی اقتدار کا خاتمہ، بحری طاقت میں مسلمانوں کی کمزوری، عیسائی اقوام کی اسلام دشمنی، مسلمانوں کے ہاتھوں صلیبی جنگوں میں شکست کھا جانے کی وجہ سے ان کے اندر انتقامی جذبات کا نشوو نما، یورپ کی روز افزوں صنعتی ترقی، یہ سب اسباب افریقہ میں استعمار کے داخلے کے لیے راہیں ہموار کر رہے تھے۔ بیسویں صدی کے ربع اوّل کے اختتام سے پہلے پورے براعظم افریقہ پر استعمار کا تسلط مکمل ہو گیا۔ اور چونکہ استعمار کے اصل حریف مسلمان تھے، اس لیے اس نے مسلمانوں ہی کو خصوصی تشدّد و انتقام کا ہدف بنایا۔ آئندہ صفحات میں ہم مختلف عنوانوں کے تحت مغربی استعمار کے اس سلوک کو بیان کریں گے جو اُس نے افریقہ کی مسلم اقوام کے ساتھ روا رکھا ہے۔

اس بحث سے ہم ایک اور پہلو کو بھی اُجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ مغربی اقوام آج ہمیں رواداری اور مذہبی بے تعصبی کا درس دیتے ہوئے نہیں تھک رہی ہیں اور ہمارے ہاں بہت سے سادہ لوح حضرات ان سے یہ سبق خوب حاصل کر رہے ہیں۔ وہ ہم سے کہتے ہیں کہ مذہب کے معاملہ میں آدمی کو بڑا فراخ دل ہونا چاہیے، مذہب کی بنا پر انسان اور انسان میں کوئی فرق نہ کرنا چاہیے، اور کسی شخص کے ساتھ اس لحاظ سے کوئی امتیازی برتاؤ نہ کرنا چاہیے کہ وہ تمہارے مذہب سے تعلق نہیں رکھتا۔ ہمارے ہاں بہت سے "عقل مند" ایسے ہیں جو بڑی سعادت مندی کے ساتھ اُن کی اِس تلقین کو قبول کرتے ہیں، عیسائی مشنریوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، ان کے مدرسوں اور کالجوں اور ہسپتالوں کو بڑی فراخ دلی کے ساتھ مسلمانوں کے قومی خزانے سے گرانٹ دیتے ہیں، اور بسا اوقات مفت زمینیں تک انہیں دے ڈالتے ہیں۔ اب ذرا دیکھیے کہ جو لوگ ہمیں یہ سبق دے رہے ہیں، انہوں نے خود افریقہ میں مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا ہے اور اِس بیسویں صدی کے نصف دوم میں بھی وہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔

افریقہ کے بارے میں آگے ہم جو کچھ بیان کریں گے اُس کی بنیاد زیادہ تر بریگیڈیر گلزار احمد صاحب

کی کتاب تذکرہ افریقہ ہے۔ اگرچہ ہمارے پاس اس معاملے میں دوسری معلومات کا بھی بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ مگر ہم اس کو چھوڑ کر بریگیڈیر صاحب کی فراہم کی ہوئی معلومات پر اس لیے انحصار کر رہے ہیں کہ وہ ہماری حکومت کے ایک سرکاری مشن پر وہاں گئے تھے، ہمارے اپنے ملک کے ایک ذمّہ دار مبصر کی حیثیت سے انہوں نے وہاں حالات کا مطالعہ کیا تھا، اور انہوں نے قریب ترین زمانے میں (یعنی ۱۹۶۰ء میں) عین اس وقت یہ حالات دیکھے تھے جب بیشتر افریقی قومیں آزاد ہو رہی تھیں۔ ان کے بیانات کو آسانی کے ساتھ نہ یہ کہہ کر رد کیا جا سکتا ہے کہ یہ شاید پرانی باتیں ہونگی، اور نہ یہ کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے کہ نہ معلوم غیر ممالک کے مصنّفوں اور اخبار نویسوں نے حقیقت کے ساتھ اپنی طرف سے کیا کچھ ملا دیا ہوگا۔

غلاموں کی تجارت | داھومی کے حالات کے تحت صاحب موصوف لکھتے ہیں:

"پرتگالی اور فرانسیسی یہاں کی حکومت کی طرف توجہ نہ دیتے تھے۔ ان کا مقصد غلاموں کی تجارت تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں غلاموں کی تجارت بیس ہزار سالانہ سے گھٹ کر بمشکل دس ہزار رہ گئی۔ اس کے باوجود وہ تجارت کرتے رہے۔ جب غلاموں کی تجارت غیر قانونی قرار دے دی گئی، اس وقت بھی داھومی سے غلاموں کی تجارت ہوتی رہی . . . آخری جہاز جو اس ملک سے غلام لے کر روانہ ہوا وہ پرتگالی جہاز تھا۔ یہ ۱۸۵۸ء کا واقعہ ہے۔ اب تک یورپی اقوام نے محض چند قلعوں پر قبضہ کر رکھا تھا جہاں وہ غلاموں کو جمع کرتے رہتے تھے اور جہاز آنے پر انہیں برآمد کر دیتے تھے" (ص ۳۷)

سینی گال کے حالات میں لکھتے ہیں:

"یہاں ساحل کے قریب ہی ایک جزیرہ ہے۔ گورے نام ہے۔ جزیرہ میں سب سے پرانا قلعہ پرتگالی دَور کا ہے . . . شمال مغربی کونے پر ایک چٹان پر واقع ہے۔ اس پر قدرے بڑا مگر بیشتر زمین دوز قلعہ ہے۔ یہ فرانسیسی دَور کا ہے۔ فرانس اور انگلستان کی جنگوں کے زمانے میں یہ جزیرہ پندرہ بیس سال تک انگریزوں کے ہاتھ میں بھی رہا ہے۔ اکثر مکان پرانے ہیں۔ ان مکانوں میں سولہویں صدی سے انیسویں صدی کے اوائل تک غلام

بند رکھے جاتے تھے۔ اور جب کبھی یورپ سے جہاز آتے تو ان میں سوار کر دیئے جاتے تھے ایک مکان تفصیل سے دیکھا۔ قلعوں کے تہ خانوں کی طرح تنگ و تاریک کوٹھریاں۔ مکان کا ایک دروازہ سمندر کی طرف کھلتا ہے۔ اس میں سے غلام نکال کر کشتیوں میں سوار کیے جاتے تھے۔ جزائر غرب الہند اور امریکہ کے کھیتوں پر کام کرنے کے لیے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ہر سال غلام افریقہ سے لے جائے جاتے۔ آدھے تو راستے میں ہی بھوک، پیاس اور مار پیٹ کا شکار ہو جاتے۔ کچھ سمندر میں کُود کر عذاب سے نجات پاتے اور باقی ماندہ خود اور آئندہ کی نسلوں کے لیے غلامی پر مجبور کیے جاتے"۔ (ص ۱۰۲)

گھانا کے حالات کے تحت لکھتے ہیں:

"آج صبح (۱۲ جون ۶۰ء) سٹو فر قصر بھی دیکھا۔ یہ سترھویں صدی کی عمارت ہے۔ ڈنمارک والوں نے اس کی تعمیر کی۔ عمارت کے بعض حصے بعد میں اٹھارویں صدی کے دوران اضافہ کیے گئے۔ اس میں غلاموں کو بند رکھا جاتا تھا۔ جہاز آنے پر انہیں نیچے ہی نیچے سمندر تک لے جایا جاتا۔ اور وہاں سے کشتیوں میں ڈال کر جہاز تک پہنچا دیئے جاتے۔ قید خانوں کا منہ کنوئیں کی طرح کھلتا ہے یہی دروازہ ہوا کرتا تھا۔ غلاموں کو اس میں اتار کر سیڑھی کھینچ لی جاتی تھی۔ کچھ حوالات کی قسم کے کمرے بھی ہیں۔ نہایت مضبوط۔ لوہے کے دوہرے دروازے، کھڑکیوں میں لوہے کی موٹی سلاخوں کی تین قطاریں۔ دوسری طرف ایک اور قید خانہ ہے۔ یہ بھی سمندر کی طرف کھلتا ہے۔ کچھ حصہ انیسویں صدی کا ہے...

اب یہ عمارت عام طور پر خالی رہتی ہے۔ صرف سرکاری دعوتوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ سامنے باغ ہے۔ چمن، روشیں، پھولوں کی کیاریاں۔ ان کو دیکھ کر احساس بھی نہیں ہوتا کہ کبھی اس جگہ قدم رکھنے کے معنی دائمی غلامی کے ہوا کرتے تھے۔ عقبی جانب کی دیوار سے سمندر کی لہریں ٹکراتی ہیں۔ اور مسلسل شور بپا کرتی رہتی ہیں۔ اس شور میں شاید ان سینکڑوں روحوں کی چیخ پکار بھی شامل ہو جنہوں نے ان کال کوٹھڑیوں کی دیواروں

کے سامراج نے بیچ کر غلامی سے نجات حاصل کی ہو گی۔ غلاموں میں مرد، عورتیں اور بچے بھی شامل ہوتے تھے۔
سننے میں آیا ہے کہ یورپی داروغاؤں کے خلاف اکثر یہ شکایت ہوتی تھی کہ وہ لڑکیوں کی
عصمت دری بے دریغ کیا کرتے تھے۔" (ص ۱۶۸)

کیمرون مغربی افریقہ کے ساحل پر ایک ریاست ہے۔ پہلی عالمی جنگ تک جرمن مقبوضات میں شامل تھی۔ جنگ کے بعد زیادہ حصہ فرانس کو امانت کے طور پر دیا گیا۔ تھوڑا حصہ جو برطانیہ کو دیا گیا دو حصوں میں بٹ گیا: شمالی کیمرون اور جنوبی کیمرون۔ شمالی حصّہ کی اکثریت مسلمان ہے اور جنوبی حصّہ کی اکثریت عیسائی۔ کیمرون کے تحت مصنّف تذکرہ افریقہ میں لکھتے ہیں:

"یورپ نے یہاں اشیاء کی تجارت کی بجائے غلاموں کی تجارت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلامی سے بچنے کے لیے افریقہ کی آبادی پہلے کی نسبت اور زیادہ جنگلوں میں پناہ گزین ہونے لگی۔ جب غلاموں کی تجارت ختم ہوئی تب جا کر وہ جنگلوں سے نکلنے پر آمادہ ہوئے۔ اس دوران ان کی ابتدائی تہذیب بھی مٹ چکی تھی" (ص ۲۵۵)

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ ان کی ابتدائی تہذیب مٹ گئی اور وہ انسانی تمدّن کے قافلے سے جُدا ہو گئے، بلکہ انہیں خود انسانوں سے سخت وحشت ہو گئی اور وہ انسانوں کا سامنا کرنے سے خوف کھانے لگے۔ جنگل کے درندوں اور اژدہوں سے انہیں کوئی خطرہ محسوس نہ ہوتا تھا، جنگل کی تاریکی اور سنسناہٹ ان کو ہراساں نہ کرتی تھی، جنگل کے غار اور کھوہ ان کو اپنے گھروں سے زیادہ پُرسکون محسوس ہو رہے تھے۔ اگر انہیں کسی چیز سے خطرہ و خوف لاحق رہتا تھا تو وہ انسان تھا۔ انہی جیسا سیاہ فام اور سیدھا سادہ انسان نہیں، بلکہ "متمدن" اور "مہذّب" انسان۔ سفید رو انسان۔ "رواداری" کا ڈھنڈورا پیٹنے والا انسان۔ اس انسان کا سایہ بھی اگر وہ دیکھ لیتے تو اُن کے بوڑھے اور جوان، اُن کی عورتیں اور بچے بلبلا اُٹھتے اور موت کو آوازیں دینے لگتے۔ اس وحشت و سراسیمگی کی حالت میں یہ لوگ جنگل میں رہ کر، انسانی دنیا کا سامنا کیے بغیر، اپنی ضروریاتِ زندگی کس طرح پوری کرتے تھے، اس کی تفصیل بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ مصنّفِ "تذکرۂ افریقہ" نے گھانا کی رُوداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"موجودہ گھانا کے اکثر اضلاع کے باشندے مستقل طور پر جنگلوں میں رہنے لگے متمدن اقوام سے ملنے میں حجاب محسوس کرتے تھے . . . . آبادیوں سے ان غریبوں کا لین دین عجیب و غریب طریقہ پر ہوا کرتا تھا جنگل کے کنارے پہنچ کر تاجر چند روز تک ڈھول بجاتے رہتے۔ جوں جوں جنگل کے قبائل ڈھول کی آواز سنتے وہ جنگل کے کناروں کے قریب اکٹھا ہونا شروع ہو جاتے اور جواباً ڈھول سے اطلاع دیتے کہ آگئے ہیں۔ دو یا تین دن کے بعد تاجر ڈھول بجا کر چند میل عقب میں چلے جاتے، اور لائی ہوئی اشیاء کی گٹھڑیاں کھول کر انہیں قطار میں رکھ جاتے۔ قبائل جنگل سے نکل کر آتے اور اشیاء پسند کرتے۔ ہر شے کے مقابلے میں مناسب مقدار کا سونا رکھ دیتے۔ ڈھول بجاتے اور جنگل میں چھپ جاتے۔ تاجر جب آتے تو سونا دیکھتے۔ اگر مقدار قبول ہوتی تو سونا لے گئے اور اشیاء چھوڑ گئے۔ ورنہ پھر ڈھول بجاتے اور عقب میں چلے جاتے۔ قبائل دوبارہ آتے اور مزید سونا رکھتے، یا نہ رکھتے۔ جب تاجر بالآخر اپنے تئیں کافی سونا حاصل کر لیتے تو چلے جاتے اور نمک اور دیگر ضروریات قبائل کے لیے چھوڑ جاتے۔" (ص ۱۷۲)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغرب کی ان "مہذب" اقوام نے افریقہ میں غلاموں کا شکار کرنے کی جو مہمات مدتہائے دراز تک جاری کیے رکھیں، انہوں نے افریقہ کے باشندوں کو کس حال تک پہنچا دیا تھا۔ اس داستان کی تکمیل کے لیے ہم بریگیڈیر صاحب کے بیانات پر مزید اضافہ کرتے ہیں تاکہ "رواداری" کی علمبردار اقوام کا تاریخی کردار پوری طرح کھل کر سامنے آجائے اور انسانیت کے بارے میں انہوں نے جو موقف ماضی قریب میں اختیار کیے رکھا ہے اُس کی روشنی میں اُن کے حال کے دعووں کا جائزہ لیا جا سکے۔

افریقہ میں غلاموں کو "شکار" کیسے کیا جاتا تھا، اس کی تصویر بین کرافٹ (BAIN CRAFT) نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی یونائیٹڈ اسٹیٹس میں یوں پیش کی ہے:

"افریقہ میں غلاموں کے حاصل کرنے کا سیدھا طریقہ یہ ہے کہ رات کے اندھیرے میں گاؤں پر حملہ کیا جائے۔ بندوقیں سر کی جائیں۔ اور اگر ضرورت سمجھی جائے تو گرد میں

مزید تشدد کے لیے گاؤں کو آگ لگا دی جائے۔ اور جب گاؤں کے بدبخت لوگ آگ کے شعلوں سے بچنے کے لیے ننگ دھڑنگ بھاگ کھڑے ہوں تو ان کو پکڑ لیا جائے اور جو مزاحمت کرے اُسے گولی مار دی جائے" (ص ۶۸)

یہ افریقی انسان جس بیدردی اور سفاکی کے ساتھ امریکہ پہنچائے جاتے تھے اور ان کے ساتھ جس بے حیائی کا سلوک کیا جاتا تھا اس کی چند جھلکیاں نائیجیریا کے سابق انگریز گورنر سر ایلن برنز کی زبانی سنیے۔ وہ اپنے ایک ہم مذہب پی۔ ایف برٹن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"لمبے سفر میں غلاموں کے جہازوں میں جو غلام ٹھونسے جاتے تھے گرمیوں کے موسم میں بحراوقیانوس کو پار کرتے ہوئے ان کی جو حالت ہو جاتی تھی اُس سے یہ بات طشت از بام ہو جاتی ہے کہ کیوں ہر سفر میں بیسیوں غلام مر جاتے تھے، اور کیوں بچے کھچے موت سے بھی بدتر تکالیف سے نجات پانے کی خاطر موقع ملتے ہی سمندر میں کود جایا کرتے تھے۔ کھانے پر مجبور کرنے کی غرض سے عورتوں اور مردوں کو کوڑے لگائے جاتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ غلاموں کو اپنا منہ کھولنے پر مجبور کرنے کے لیے گرم لوہا استعمال کیا جاتا تھا تاکہ وہ ایسی غذا زہر مار کر سکیں جس کو شدید بیماری اور اذیت کی وجہ سے وہ بخوشی نہ کھا سکتے تھے۔ اُن کو ناچنے اور گانے پر آمادہ کرنے کے لیے کوڑے لگائے جاتے تھے تاکہ وہ اپنی بدقسمتی کا احساس نہ کر سکیں۔ جہاز کے عہدیداروں اور ملاحوں کو عورتوں کے معاملے میں غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ غلام مردوں کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے ساتھ باندھا جاتا تھا اور ان کو اکثر ایک دوسرے پر اس طرح ٹھونسا جاتا تھا کہ وہ صرف ایک پہلو پر لیٹ سکتے تھے۔ ان میں ایک دوسرے کے درمیان صرف ڈیڑھ فٹ بلندی کے تختے ہوتے تھے تاکہ وہ پہلو نہ بدل سکیں۔ ۱۷۸۵ء کے قریب ایک جہاز سات سو غلاموں کو لے کر چلا، اور اس قدر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کہ موسم کی کسی خاص خرابی یا معمول سے زیادہ لمبے سفر کے بغیر بھی انہیں ایسی ہلاکت انگیز تکالیف پہنچیں کہ جہاز کے ویسٹ انڈیز پہنچنے سے قبل نصف کے قریب غلام

دم توڑ گئے۔"

"جہاز سے اُتارے جانے کے بعد بھی ان کو شدید تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ زنجیروں میں باندھ کر ان کے بے رحم شکاری ان کو ساحل کے لاتے اور تکلیف وہ فاصلے طے کراتے، اور فروخت کرنے سے پہلے ان کو کٹہروں میں جمع کیا جاتا تھا۔ چنانچہ غلاموں کا ایک ڈچ تاجر جو سترھویں صدی کے اواخر میں مغربی ساحل پر رہتا تھا اور جس کا نام ولیم بوس مین تھا لکھتا ہے کہ جب یہ ملازم آتے تو سب کو قید خانے میں ٹھونس دیا جاتا، اور جب ہم ان کو فروخت کرنا چاہتے تو ہمارے سپاہی ایک کھلے میدان میں لاتے۔ وہاں انہیں مکمل برہنہ کر کے معاینہ کیا جاتا۔ اس معاینے میں مرد و عورت کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اسی اثنا میں لوہے کی ایک سلاخ گرم کی جاتی تھی جس پر کمپنی کا نام یا نشان کندہ ہوتا تھا۔ اس سلاخ سے کمپنی کا نام یا نشان ان کے سینوں پر داغا جاتا تھا۔"

غلام سازی اور انسانیت سوزی کا یہ کاروبار کس قدر وسیع پیمانے پر ہوا اس کا اندازہ ذیل کے اقتباسات سے آپ لگا سکتے ہیں:

"۱۶۸۰ء اور ۱۷۰۰ء کے درمیان انگریزوں نے افریقہ سے تین لاکھ غلام برآمد کیے۔ انگریزوں کو اسپین کے ساتھ ایک معاہدہ کے تحت یہ خاص ٹھیکہ ملا ہوا تھا کہ وہ اسپینی ویسٹ انڈیز میں چار ہزار آٹھ سو سالانہ کے حساب سے نیگرو سپلائی کریں۔ ۱۷۰۰ء اور ۱۷۸۶ء کے درمیان انگریزوں نے جمیکا میں چھ لاکھ دس ہزار غلام درآمد کیے۔ راستے میں بھی بہت بڑی تعداد مرگئی جو اس تعداد میں شامل نہیں ہے۔"

یہ اعداد صرف انگریزوں کے درآمد کردہ، غلاموں کی تعداد کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک اور مصنف ان کی کم از کم تعداد ڈیڑھ کروڑ بتلاتا ہے۔ دوسری یورپی اقوام نے امریکہ کو جو غلام سپلائی کیے ہیں ان کی تعداد کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ٹوڈلے اشامپ کا بیان ہے:

"تخمینہ کیا گیا ہے کہ صرف فرانسیسی مقبوضات سے تین صدیوں کے اندر ایک کروڑ میں

لاکھ غلام حاصل کیے گئے۔ اور اس سے نچلے علاقے سے پرتگالیوں نے جو غلام حاصل کیے وہ اس سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ اگر پرتگال کے حاصل کردہ غلاموں کی تعداد ایک کروڑ ستر لاکھ فرض کی جائے تو مجموعی تعداد تین کروڑ ہوتی ہے[1]۔"

محققین نے ان غلاموں کی مجموعی تعداد کے بارے میں جو اعداد و شمار جمع کیے ہیں اُن کی رُو سے یہ تعداد چھ کروڑ ہو جاتی ہے۔ اور یہ ان بدقسمت انسانوں کی تعداد ہے جو امریکہ کے ساحلوں پر زندہ پہنچ گئے۔ اور اگر اُس تعداد کو بھی ان میں شامل کر لیا جائے جو راستہ ہی میں دم توڑتی رہی تو اس حساب سے غلاموں کے شکاریوں نے بارہ کروڑ افریقیوں کو گرفتار کیا۔

ان مظالم کے بارے میں عیسائیت نے جو کردار ادا کیا ہے اُس کا بیان بھی بے محل نہ ہوگا: ڈاکٹر بلائیڈن نے اپنی کتاب میں پادری رائٹ ریورنڈ ولیم میڈس کی کتاب مواعظ کا اقتباس درج کیا ہے جو اُس نے آقاؤں اور غلاموں کے لیے لکھی تھی۔ اس کتاب مواعظ میں پادری صاحب غلاموں کو تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"خدائے بزرگ و برتر اس جہان میں تم کو غلام بنا کر راضی ہوا۔ اس نے اس جہان میں تمہاری تقدیر محنت اور افلاس کے لیے بنائی ہے جس کے سامنے تمہیں سرِ اطاعت خم کرنا چاہیے۔ یہی مرضیٔ الٰہی ہے اور ہونی بھی چاہیے۔ تم جانتے ہو کہ تمہارے جسم تمہارے اپنے نہیں ہیں بلکہ تمہارے حاکموں کی مرضی اور اختیار میں ہیں[2]۔"

یہ ہے مغربی اقوام کے اس "روادارانہ" سلوک کا ہلکا سا نقشہ جو افریقی انسان کے ساتھ انہوں نے صدیوں تک اختیار کیے رکھا۔ اور لطف یہ ہے کہ آج مغربی اقوام اپنے اس شرمناک ریکارڈ پر پردہ ڈالنے کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے ہاں "غلامی" کے رواج کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں تاکہ دنیا اُن پر پھٹکار بھیجنے کے بجائے مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھیرائے۔

---

[1] AFRICA, DUDLE STAMP

[2] CHRISTIANITY AND ISLAM, THE NEGRO RACES

سیرالیون کی کریول آبادی | اس قصّے کا ایک اور دلچسپ پہلو ہے۔ مغربی اقوام نے افریقی باشندوں کو غلام بنا کر اپنے کھیت آباد کرنے اور اپنے کارخانے چلانے کی خدمت تو خوب لی۔ مگر جب کچھ عرصہ بعد غلام سازی کے خلاف بعض انسانی ضمیروں نے احتجاج کیا اور غلامی ممنوع قرار دے دی گئی تو پھر یہی غلام انہیں اپنی سرزمین پر چلتے پھرتے ناگوار گزرنے لگے۔ فری ٹاؤن سیرالیون کا دارالحکومت ہے۔ اس کی تاسیس کیسے عمل میں آئی، اس کے بارے میں "تذکرۂ افریقہ" کے مصنف کا بیان ملاحظہ ہو:

"فری ٹاؤن کی ابتداء کچھ عجیب طریقہ پر پڑی۔ جب انیسویں صدی میں غلامی ممنوع قرار دے دی گئی تو وہ غلام جنہوں نے امریکہ کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا، ان کو کہیں آباد کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ انہی دنوں انگلستان کے ایک ساحلی شہر (پلیمتھ) نے اپنے ہاں کی تیس پیشہ ور عورتوں کو ملک بدر کر دیا۔ ان آزاد شدہ غلاموں اور تیس بیسواؤں نے مِل جُل کر اس شہر کی بنا ڈالی۔ بعد میں کچھ آزاد شدہ اور کچھ بھاگے ہوئے غلام غرب الہند کے جزائر اور دوسرے مقامات سے یہاں آگئے۔ چونکہ ان کو برطانوی بحری بیڑے نے یہاں آباد کیا تھا اس لیے وہ برطانیہ کے ساتھ وابستہ رہے۔ جلد ہی مشن بھی آنا شروع ہو گئے اور عیسائیت کو فروغ ہوا" (ص ۱۳۲)

یہ نسل اب کریول کے نام سے مشہور ہے۔ شروع میں ان کی تعداد ۱۲۵۰ تھی جو اب تیس ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ ان میں مسلمان بھی ہیں، جو تعداد میں کم ہیں۔ اور باقی مسلمانوں کے ساتھ بے تکلف ملتے جلتے ہیں۔ ان پر یورپی رنگ اتنا نہیں چڑھا جتنا کہ عیسائی کریول آبادی پر ہے۔ مصنف تذکرۂ افریقہ ایک کریول سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وزیر مالیات سے ملاقات ہوئی۔ مسلمان ہیں۔ نام مصطفیٰ[1] ہے۔ فری ٹاؤن کے رہنے والے ہیں اور کریول آبادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۔ ۔ مصطفیٰ صاحب کا خاندان ضرور مسلمان

---

[1] آگے چل کر مصنف تذکرۂ افریقہ نے بیان کیا ہے کہ مصطفیٰ صاحب ان کی موجودگی میں سیرالیون کے نائب وزیر اعظم نامزد ہو گئے تھے۔ اور سیرالیون کی مسلم کانگرس کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں انہوں نے تقریر کی اور احمدیہ جماعت کی دعا دینوں کی تعلیمی خدمات کا اعتراف کیا۔

ہو گا۔ اور ایسا مسلمان کہ اس افراتفری اور بعد کی مشن نوازی کے باوجود اسلام پر قائم رہا۔ اس طرح کے مسلمان بہت کم ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شروع سے ہی ان غلاموں میں مسلمان کم تھے یا انہوں نے بعد میں اسلام چھوڑ دیا۔ نہ معلوم کتنے ہزاروں، لاکھوں ہوں گے جنہوں نے امریکہ اور جزائر غرب الہند پہنچ کر اسلام چھوڑ دیا۔" (۱۳۵)

نفسیاتی، ذہنی اور تہذیبی لحاظ سے کریول آبادی جس سطح کی ہے اُس کے بارے میں مصنف "تذکرۂ افریقیہ" کا بیان ہے کہ:

"وہ اپنے آپ کو آزاد شدہ غلاموں کی اولاد سمجھتے ہیں۔ اور چونکہ ایک بار یہاں سے جا کر واپس آئے تھے اس لیے اپنے آپ کو افریقیوں سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ بلکہ بقول ایک مصنف یہ اپنے آپ کو "سیاہ انگریز" سمجھتے ہیں۔ دو سو سال کے انگریزی تعلقات کی وجہ سے ان میں تعلیم زیادہ ہے۔ اکثر ملازمتیں ان ہی کے پاس ہیں۔ اب وہ پورے ملک کی آزادی پر ناخوش ہیں۔ بلکہ کھلم کھلا کہتے ہیں کہ برطانیہ نے اُن کو محفوظ علاقوں کے ساتھ ملا کر اقلیت میں بدل دینے میں زیادتی بلکہ بے وفائی کی ہے۔ ان کے رہنے سہنے کا طریقہ، ان کی زبان، بلکہ ان کی ذہنی ساخت بالکل انگریزی ہے۔ انگلستان کی طرف حسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ کب زیارت ہو گی۔ بادشاہوں اور شہزادوں، شہزادیوں کی تصویریں اُن کے گھروں میں افراط سے ملیں گی۔ اَن پڑھ سے اَن پڑھ انگریزی بولتا ہے۔ گو یہ انگریزی یہاں کی خاص زبان ہے جسے "کبوتر انگریزی" کہتے ہیں۔ فوراً کو ONE TIME کہتے ہیں۔" (۱۳۵)

مصنفِ "تذکرۂ افریقیہ" نے یہ بھی تحقیق کی ہے کہ "کریول جب یہاں آ کر آباد ہوئے اور نئیں انگریز بیسواؤں سے اُن کی نسل کا آغاز ہوا تو بعد میں بھی کریول خون میں انگریز ملاحوں، سیاحوں، فوجی سپاہیوں، انتظامی افسروں کا خون وقتاً فوقتاً ملتا رہا اور جُوں جُوں تعلقات بڑھے، تمدن کا رنگ بھی اسی قدر گہرا چڑھتا گیا اور وہ اپنے آپ کو بچھڑے ہوئے انگریز سمجھنے لگے۔" (۱۳۶)

لائبیریا کے امریکی نژاد افریقی فری ٹاؤن کی طرح لائبیریا کے قدیم شہر مان روڈیا کی ابتدا بھی دلچسپ طریقہ سے ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر میں بھی مغربی اقوام کی یہی ذہنیت کام کر رہی تھی کہ افریقی غلاموں کے آزاد ہو جانے کے بعد انہیں سفید فام نسل کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنے کا موقع نہ ملنا چاہیے۔ کیونکہ افریقی غلاموں کی حیثیت ان کی نگاہ میں کاشتکاری کے بیل سے بڑھ کر نہیں ہے۔ بیل اگر بوڑھا ہو جائے یا مالک کو اس سے کوئی دلچسپی نہ رہے تو اسے اپنے مالک کی چراگاہ میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

تذکرۂ افریقہ کے مصنف لکھتے ہیں:

"۱۸۱۷ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک انجمن وجود میں آئی جس نے اپنا مقصد یہ مقرر کیا کہ امریکہ میں جو غلام آزاد کیے گئے ہیں انھیں واپس افریقہ بھیج دیا جائے اور وہاں آباد ہونے میں اُن کی مدد کی جائے۔ اس انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ لائبیریا کا سنگِ بنیاد ہے۔"

بظاہر یہ آبادکاری انسانیت کی خدمت کے جذبہ کی عکاس نظر آتی ہے مگر اس کی ناموزونیت کے بارے میں تذکرۂ افریقہ کے مصنف کا بیان ہے کہ "اس خیال کے بانی نہ معلوم کیوں سیاہ فام باشندوں کو امریکہ سے نکالنا چاہتے تھے۔ بہرکیف وہ یہ بھول گئے کہ اُن کی پست حالت، ناخواندگی اور غربت کے باوجود اب وہ متمدن ماحول کے عادی ہو چکے تھے۔ اب اُن کا امریکہ کو چھوڑ کر پھر افریقہ کے جنگلوں کی زندگی اختیار کرنا ناممکن سی بات تھی۔ یہ مقامی قبائل کے ساتھ رہنے کے ناقابل ہو چکے تھے" اور یہ آبادکاری بھی جس طریقے سے کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ "اس پر مزید غلطی یہ کی گئی کہ جو مدد انہیں دی گئی وہ ناکافی تھی۔ یہاں انہیں ہر طرح کی تکالیف پیش آئیں۔ جسمانی تکالیف، نئی آبادی کا وجود میں لانا، موسم کی ناموافقت اور ذہنی اضطراب کے علاوہ اردگرد کے باشندوں سے جو تکالیف ملنا شروع ہوئیں وہ بہت زیادہ تھیں۔"

اس امریکی نژاد افریقی آبادی نے جب افریقی قبائل کے درمیان جنم لیا تو افریقی قبائل کو یہ بات ناگوار گزری اور دونوں کے درمیان کشمکش کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ مصنف کا بیان ہے:

"اس چھوٹی سی آبادی پر حملے ہونا شروع ہوئے، مگر یہ جنگ کے نئے ڈھنگ اب امریکہ میں دیکھ آئے تھے اور بعض سیکھ بھی آئے تھے۔ پہلے انہوں نے اپنے علاقہ کا دفاع کیا اور پھر آگے بڑھ کر دوسرے علاقوں کو اپنی تحویل میں لینا شروع کر دیا۔ مگر مان روڈ یا شہر جہاں یہ لوگ امریکہ سے آکر آباد ہوئے تھے، یہ اس تمام عرصہ میں ان کا وطن رہا۔ باقی علاقہ ان کا افریقی مقبوضہ شمار ہوا۔"

سیرالیون کے کریول جس تہذیبی اور ذہنی سطح کے ہیں لائبیریا کے "امریکی نژاد افریقی" بھی اُن سے مختلف نہیں ہیں۔" وہ مقامی افریقی باشندوں کو اب بھی "دیسی" کہہ کر پکارتے ہیں۔ باقی افریقیوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو نئی دنیا سے واپس لوٹا ہوُا برتر انسان سمجھتے ہیں۔ آج ڈیڑھ سو سال بعد بھی ملک کی آٹھ لاکھ (سرکاری اطلاعات کے مطابق بیس لاکھ) آبادی میں سے امریکی نژاد افریقیوں کی تعداد صرف پچاس ہزار ہے۔" (باقی)

رسائل و مسائل

والدین کے حقوق

سوال: ہمارے حلقۂ احباب میں چند مسائل کے متعلق بحث و اختلاف کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ براہ کرم ان کی صحیح حقیقت سے آگاہ کریں۔ مسائل درج ذیل ہیں:

(۱) کیا حدیث میں یہ مذکور ہے کہ قیامت کے دن انسان اپنی ماں کی جانب منسوب کیے جائیں گے؟ بعض اصحاب والدہ کی فضیلت اور اس کے حقوق کے سلسلے میں یہ حدیث بیان کرتے ہیں۔

(۲) کوئی باپ اپنے بیٹے یا بیٹی کو قتل کر دے تو کیا اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا؟ اور کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ قاتل مقتول کا وارث ہے اور وہ اپنے آپ کو معاف کر سکتا ہے؟ جن جرائم کا حقوق العباد سے تعلق ہے، کیا ان کے بارے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ جس فرد کی جان یا مال پر دست درازی ہوئی ہے، اگر وہ معاف کر دے تو حق مارنے والے سے باز پرس نہ ہوگی؟

(۳) ماں باپ کی اطاعت کن کن امور میں اولاد پر جائز اور فرض ہے؟ کیا والدین کے حکم سے کوئی بیٹا شرعاً مجبور ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے؟

جواب۔ (۱) اس امر میں تو کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے والدین کے حقوق و واجبات پر بہت زور دیا ہے، ان سے حُسنِ سلوک کی بہت تاکید فرمائی ہے اور اپنے حقوق کے ساتھ والدین کے حقوق بیان کیے ہیں ——— بعض صحیح احادیث میں جہاں والدین سے صلہ رحمی کا حکم دیا گیا ہے، وہاں ایک یا دو مرتبہ پہلے والدہ کا ذکر ہے اور اس کے بعد والد

کا ذکر ہے۔ لیکن جس مضمون کا حوالہ سوال میں دیا گیا ہے یہ کسی صحیح اور مستند حدیث میں وارد نہیں ہے۔ اگرچہ بعض حدیث کے مجموعوں میں ایک روایت اس طرح کی مذکور ہے لیکن محدثین اور فنِ رجال کے ماہرین کے نزدیک یہ غیر صحیح ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: یُدعی الناسُ باُمہاتہم یوم القیامۃ ستراً من اللہ علیہم (قیامت کے روز لوگوں کو ان کی ماؤں کے نسب سے پکارا جائے گا تاکہ اللہ کی جانب سے ان کی پردہ داری ہو)۔ امام ابن جوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ امام سیوطی نے اپنی کتاب التعقبات علی الموضوعات میں اگرچہ بہت سی ان احادیث کو موضوعات سے خارج قرار دیا ہے جن پر ابن جوزی نے وضع کا حکم لگایا ہے۔ لیکن اس روایت کو تعقبات، باب البعث میں ابن عدی کے حوالے سے منکر ہی لکھا ہے۔ منکر اس ضعیف روایت کو کہا جاتا ہے جس کا راوی فحش غلطی، شدید غفلت یا فسق و فجور کا مرتکب ہو۔

والدین اور بالخصوص والدہ کے اکرام و احترام پر دلالت کرنے والی واضح نصوص جب کتاب و سنت میں موجود ہیں، تو اس کے بعد ایسی منکر یا موضوع روایت کا سہارا لینے کی کیا حاجت ہے جس سے ماں کی افضلیت کا کوئی خاص پہلو نہیں نکلتا اور جو قرآن مجید (سورۂ احزاب) کی اس آیت سے بھی مطابقت نہیں رکھتی جس میں لوگوں کو ان کے باپوں کے نسب سے پکارنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

(۲) یہ صحیح ہے کہ فقہاء کی اکثریت اس امر کی قائل ہے کہ باپ اولاد کو قتل کرے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا لیکن یہ اس بنا پر نہیں کہ باپ بیٹے کا وارث یا ولیٔ قصاص ہے اور وہ چاہے تو اپنے آپ کو معاف کر دے۔ اپنے جرم پر اپنے آپ ہی کو قابلِ معافی قرار دینے کا تصور بالکل لغو ہے اور یہ بات بھی غلط ہے کہ ہر شخص جو مقتول کا وارث بن سکتا ہو یا مطالبۂ قصاص کا قانونی حق رکھتا ہو، وہ اگر خود ہی قاتل ہو تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا لیکن یہ اس بنا پر نہیں کہ باپ بیٹے کا وارث یا ولیٔ قصاص ہے اور وہ چاہے تو اپنے آپ کو معاف کر دے۔ اپنے جرم پر اپنے آپ ہی کو قابلِ معافی قرار دینے کا تصور بالکل لغو ہے اور یہ بات بھی غلط ہے کہ ہر شخص جو مقتول کا وارث بن سکتا ہو یا مطالبۂ قصاص کا قانونی حق رکھتا ہو، وہ اگر خود ہی قاتل ہو تو اس سے قصاص نہیں لیا

جاسکتا۔ باپ کو اولاد کے قتل کرنے پر قصاص سے صرف اس وجہ سے مستثنیٰ سمجھا گیا ہے کہ اس کے حقوق اولاد پر بے حد و حساب ہیں۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک صحابی اور اس کے بیٹے کی ناچاقی کی خبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے بیٹے کو مخاطب کر کے فرمایا: اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ (تو اور تیرا مال و متاع سب تیرے والد کا ہے)۔ ایک دوسری حدیث میں اولاد کو والدین کی کمائی میں شمار کیا گیا ہے۔ اولاد کے بالمقابل والدین کی اس غیر معمولی مرتبت و منزلت کی بنا پر یہ استنباط کیا گیا ہے کہ والدین سے اولاد کا قصاص نہ لیا جائے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں ہے کہ اگر والد اولاد کو ناحق قتل کرے تو عنداللہ بھی اس سے باز پُرس نہ ہوگی۔

والدین کے ماسوا دوسرے اعزہ جنہیں وراثت یا قصاص کی ولایت اور مطالبے کا حق پہنچتا ہے وہ اگر خود اپنے مورث کے قاتل ہوں تو وارث ہونے کے باوجود ان سے قصاص لیا جاسکتا ہے اور اگر محض ورثہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے قتل کا ارتکاب کیا ہو تو وہ ارشاد نبوی کے مطابق محروم الارث بھی قرار پائیں گے۔

اسلامی شریعت کا یہ اصول بھی ہرگز نہیں ہے کہ جن جرائم کا تعلق حقوق العباد سے ہے، ان میں اگر مظلوم یا اس کا ولی معاف کردے تو ریاست ظالم یا مجرم سے مواخذہ نہیں کرسکتی۔ بہت سے جرائم جن کا تعلق انسان کی جان، مال یا آبرو سے ہے وہ حکومت کی دست اندازی کے قابل اور احتساب کے لائق ہیں اور وہ فریقین کے مابین قابل راضی نامہ بھی نہیں۔ مثال کے طور پر زنا، چوری یا ڈاکہ ایسے جرائم ہیں جن پر ریاست ہر حال میں گرفت کرے گی اور سزا دے گی کیونکہ انفرادی قتل تو بسا اوقات ذاتی پرخاش یا وقتی محرکات پر مبنی ہوسکتا ہے جس میں مقتول کے ورثا اگر دیت یا عفو و درگزر پر راضی ہو جائیں تو مزید انتقامی کارروائی، خونریزی اور فساد کا سدِباب ہوسکتا ہے، لیکن مذکورہ بالا اجتماعی جرائم کی نوعیت ایسی ہے جن میں نرمی یا چشم پوشی برتنے سے مزید شر اور فتنوں کے پھیلنے کا امکان قوی ہوجاتا ہے۔ قتل میں بھی اگرچہ مقتول کے اولیاء دیت لے لیں یا معاف کردیں تو قصاص کی سزا تو نافذ نہ ہوگی، لیکن بعض فقہاء کا قول یہ ہے کہ اولیاء کے راضی ہوجانے کے باوجود اگر اسلامی حکومت یہ

سمجھے کہ فتنہ و فساد کے اسباب کا پوری طرح قلع قمع کرنے کے لیے قاتل کو کچھ تادیب و تعزیر ضروری ہے، تو ایسا کیا جا سکتا ہے۔

(۳) جو افعال خدا و رسول کے نزدیک ممنوع یا مذموم ہیں ان میں کسی کی اطاعت جائز نہیں، بقیہ امور میں والدین کی اطاعت جائز و مستحسن بلکہ اکثر حالات میں لازم ہے۔ جہاں تک باپ کے کہنے پر بیوی کو طلاق دینے کا سوال ہے، اس کا جواب بھی یہی ہے کہ بیٹا صرف اسی صورت میں طلاق دے، جب کہ والد کا حکم کسی مصلحت شرعی پر مبنی ہو، ورنہ ناحق طلاق خدا کی نگاہ میں بہرحال ناپسندیدہ اور مبغوض ہے۔ دراصل یہ مسئلہ آغاز میں اس طرح پیدا ہوا تھا کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادے سے کہا تھا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو اور انہوں نے تعمیلِ ارشاد کرتے ہوئے طلاق دے دی تھی۔ مگر ظاہر ہے کہ ہر باپ حضرت عمرؓ کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ حضرت عمرؓ ایک جلیل القدر صحابیٔ رسول اور صاحبِ اتقاء انسان تھے۔ ان کی پاکیزہ زندگی اور بے مثال سیرت کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے بجا طور پر یہی توقع کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کسی معقول علت اور دینی مصلحت ہی کے تحت کیا ہو گا جس کی وضاحت مناسب یا ضروری نہ ہو گی اور حضرت ابن عمرؓ نے اسی اعتماد کی بنا پر آپ کا کہا مان لیا ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ نے وجہ بیان کر دی ہو مگر وہ آگے نقل ہونے سے رہ گئی ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک باپ جب چاہے، اپنے بیٹے سے بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کر سکتا ہے اور بیٹے کے لیے اس کی تعمیل کیے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔

لوہے کی انگوٹھی کا جواز و عدمِ جواز

سوال:- "آئین" (۳۰ ستمبر ۱۹۶۶ء، لاہور) میں لوہے کی انگوٹھی کے جواز اور عدمِ جواز کے متعلق ایک استفسار کے جواب میں یہ منقول ہے کہ اس کی حرمت کا کوئی حکم قرآن و حدیث میں نہیں ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی لوہے کی تھی جس کے اوپر چاندی چڑھی ہوئی تھی۔

اس جواب پر مجھے تو اطمینان نہیں ہوا۔ مشکوٰۃ (باب الخاتم، صفحہ ۳۷۸، حضرت بریدہؓ سے مروی ہے: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لرجل علیہ خاتم من شبہٍ مالی اجد منک ریح الاصنام فطرحہ ثم جاء وعلیہ خاتم من حدید فقال مالی اری علیک حلیۃ اھل النار فطرحہ فقال یا رسول اللہ من ای شیئ اتخذہ قال: من ورق (رواہ الترمذی وابوداؤد)

مؤطا امام محمد صفحہ ۷۰، پر حضرت ابن عمرؓ کی روایت کے بعد امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے یہ نوٹ بھی قابل توجہ ہے۔

قال محمد وبھذا ناخذ لا ینبغی للرجل ان یتختم بذھب ولا حدید ولا صفر ولا یتختم الا بالفضۃ۔

میرا خیال یہ ہے حدیث کی رُو سے قطعی حرمت تو سونے کی انگوٹھی کے لیے ہے، تاہم لوہے، تانبے، پیتل وغیرہ دھاتوں کی انگوٹھی ناجائز اور مکروہ ضرور ہے۔ مردوں کے لیے صرف چاندی کی انگوٹھی کی اجازت ہے، جیسا کہ امام محمد کی رائے ہے۔

جواب: اس امر میں فقہاء و محدثین کا کامل اتفاق ہے کہ چاندی کی انگوٹھی مرد اور عورت کیلئے اور سونے کی انگوٹھی صرف عورت کے لیے جائز ہے۔ لوہے اور دوسری دھاتوں کا معاملہ مختلف فیہ ہے لیکن صحیح تر مسلک یہ ہے کہ مرد کے لیے حُرمت صرف سونے کے زیور کی ہے اور جہاں تک لوہے کی انگوٹھی کا تعلق ہے اس کا استعمال بلا کراہت جائز ہے۔ آپ نے ترمذی اور ابوداؤد کی جو حدیث نقل کی ہے، اس میں اگرچہ لوہے کی انگوٹھی کو دوزخیوں کا زیور کہا گیا ہے، لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ بخاری اور مسلم میں صحیح احادیث موجود ہیں جن میں ایک صحابی کا ذکر ہے کہ انہوں نے ایک عورت سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر کی فراہمی کی ہدایت اس طرح کے الفاظ میں فرمائی تھی کہ تم مہر کا انتظام کرو خواہ وہ ایک لوہے کی انگوٹھی ہی ہو۔ مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق میں الفاظ یہ ہیں: انظر ولو خاتما من الحدید۔

امام بخاری بھی کتاب النکاح کے متعدد ابواب میں اس حدیث کو لائے ہیں۔ مؤطا امام مالک، کتاب النکاح، باب یصلح مہراً ما یصلح ثمناً میں بھی یہ حدیث مروی ہے۔ وہاں فالتمس ولو خاتماً من حدید کے الفاظ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ لوہے کی انگوٹھی کے جواز پر دلالت کرنے والی احادیث مستند ہیں، اور ان کے بالمقابل دوسری روایات بہت کمزور ہیں۔ ترمذی کی روایت کو امام ترمذی نے غریب لکھا ہے۔ اس کے ایک راوی عبداللہ بن مسلم مروزی پر محدثین نے جرح کی ہے۔ امام خطابی نے معالم السنن، شرح ابی داؤد میں اس حدیث کی تشریح میں اس راوی کے متعلق ابو حاتم رازی کا یہ قول نقل کیا ہے: یکتب حدیثہ ولا یحتج بہ (اس راوی کی حدیث لکھی جا سکتی ہے مگر قابلِ حجت نہیں)۔ لوہے کی انگوٹھی سے متعلق صحیحین کی مذکورہ بالا حدیث کی شرح کرتے ہوئے امام نووی تحریر فرماتے ہیں: وفی ھذا الحدیث جواز اتخاذ خاتم الحدید وفیہ خلاف للسلف ولاصحابنا فی کراھتہ وجہان، اصحہما لایکرہ، لان الحدیث فی النہی عنہ ضعیف وقد اوضحت المسئلۃ فی شرح المہذب (اس حدیث کی رُو سے لوہے کی انگوٹھی پہننا جائز ہے اور اس معاملے میں سلف میں اختلاف ہے۔ اس کی کراہت کے بارے میں اصحاب الحدیث کی دو رائیں ہیں جن میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ مکروہ نہیں ہے کیونکہ اس کی نہی سے متعلق حدیث ضعیف ہے اور میں نے اس مسئلے کو شرح مہذب میں واضح کر دیا ہے)۔

مؤطا امام محمدؒ کی جس حدیث کا حوالہ آپ نے دیا ہے، اس کا مضمون ایسا نہیں ہے جس سے مرد کے لیے چاندی کے ماسوا ہر دھات کی ممانعت ثابت ہوتی ہو۔ اس میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورؐ نے سونے کی انگوٹھی اتار کر پھینک دی اور صحابہ کرام نے بھی اپنی انگوٹھیاں پھینک دیں۔ زیادہ قرین قیاس امر یہی ہے کہ صحابہ کرام نے جو انگوٹھیاں اتاری تھیں وہ بھی سونے کی ہوں گی۔ اس کی تائید و توضیح دوسری احادیث سے ہوتی ہے جو حضرت ابن عمرؓ ہی سے مروی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورؐ نے سونے کی انگوٹھی کچھ عرصہ تک پہنی تھی، جسے دیکھ کر صحابہ کرام نے بھی سنہری انگوٹھیاں

(باقی ص ۲۳۰ پر)

مطبوعات

قرآنی تعلیمات حصہ اوّل و دوم | تالیف مولانا محمد یوسف اصلاحی ۔ شائع کردہ: مکتبہ الحسنات رامپور (بھارت، قیمت فی جلد ۴ روپے۔

قرآن مجید باری تعالیٰ کی طرف سے وہ آخری کتابِ ہدایت ہے جو ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت اور عملی رہنمائی میں بندگانِ خدا تک پہنچائی گئی۔ یہ کتاب اتنی جامع ہے کہ اس سے زیادہ جامعیت کا انسان تصور نہیں کر سکتا۔ زندگی کا کوئی شعبہ اور فکر و نگاہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے بارے میں اس کتاب میں واضح ہدایات نہ ملتی ہوں۔ جتنی وسیع اور جامع اس کتاب کی تعلیمات ہیں اتنے وسیع اور متعدد اس کی خدمت کے میدان ہیں۔ اس کا معجزانہ اسلوبِ بیان، اس کے الفاظ، اس کی تراکیب، اس کی بلاغت، اس کی اثر آفرینی، اس کا طرزِ خطابت، اس کا طریقِ استدلال، اس کے گنج ہائے معانی، اس کے احکام الغرض بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں گوشوں میں شروع سے لے کر آج تک غور و فکر کیا جاتا رہا ہے اور اس بحرِ بیکراں سے اپنی ہمت اور استعداد کے مطابق حکمت کے موتی تلاش کیے جاتے رہے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس مقدس کتاب کی جس پہلو سے بھی خدمت کی جائے وہ مومن کا فریضہ بھی ہے اور بہت بڑی سعادت بھی۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں فاضل مصنف نے بڑی عمدگی کے ساتھ قرآن مجید کی تعلیمات کو ایک تصنیفی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے اور مستقل عنوانات کے تحت متعلقہ آیات کو درج کیا ہے۔ آیات کی ترجمانی بڑی سادہ اور دلکش اور ان کی تشریح عام فہم اور مختصر ہے۔ کہیں کہیں مزید وضاحت کے لیے احادیث بھی نقل کی گئی ہیں۔ ہماری رائے میں یہ مجموعہ تمام مسلم اور غیر مسلم

(بقیہ اشارات)

معاملات کو مادی نقطۂ نظر سے جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ وہاں حلال وحرام اور خوب وناخوب کے اصل پیمانے مادی فوائد اور نقصانات ہونگے۔ اس کے مقابلے میں وہ نظام جو سب سے زیادہ زور اخلاقی قدروں کو دیتا ہے اس میں صحیح اور غلط کا فیصلہ انہی قدروں کے مطابق ہوگا اور انہی کی نسبت سے ساری چیزوں کی اہمیت کا اندازہ کیا جائے گا۔

مسلم قوم کو آج جو پیچیدہ مسائل درپیش ہیں اور جن کی پیچیدگی ہر روز بڑھتی چلی جارہی ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم اس سادہ سی حقیقت کو ابھی تک پوری طرح سمجھ نہیں پائے اور اس بنا پر بہک کر ہر راہرو کے ساتھ بے سمجھے بوجھے چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید نے بڑے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَاۗءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ	اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کریگا سو وہ اُس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں ناکاموں اور نامرادوں میں سے ہوگا اللہ کیسے ایسے لوگوں کو ہدایت دیگا جنہوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر اختیار کر لیا حالانکہ وہ خود

(بقیہ مطبوعات)

حضرات کے لیے قرآن کے پیغام اور دعوت کو سمجھنے اور کلام الٰہی سے مناسبت کرنے کے لیے بڑا مفید اور کار آمد ہے۔ پہلے حصّے میں ایمانیات، تزکیہ نفس اور عبادات کا ذکر ہے۔ دوسرا حصّہ حسن اخلاق، حُسن معاشرت، معاملات اور تبلیغ دین پر مشتمل ہے۔ کتاب کا معیار طباعت وکتابت بڑا عمدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے مرتب اور ناشر کو اجر جزیل عطا فرمائے۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (آل عمران - ۸۶) اس بات پر شہادت دے چکے ہیں کہ یہ رسول حق پر ہے اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آچکی ہیں اللہ ظالموں کو تو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے دعوے کے باوجود ہمیں اُن پر یقین پیدا نہیں ہوتا اور ہم اُس کے دین کے علاوہ کچھ دوسرے افکار و نظریات اور کچھ دوسرے عقائد و تصورات میں اپنی فلاح کی راہ ڈھونڈتے ہیں۔

مسلم قوم اس وقت واقعی دنیا میں سب سے زیادہ پست اور پسماندہ ہے۔ یہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے بڑی کمزور ہے۔ اسے ہر طرف سے مختلف مصائب گھیرے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہمارا اسلام سے تعلق ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اللہ کی بندگی، اُس کے رسول کی غلامی اور اُس کے دین کی اتباع کے دعوے کے باوجود کچھ دوسرے معبود بنا رکھے ہیں، کچھ دوسرے رہنماؤں کی غلامی کا طوق گلے میں پہن لیا ہے اور احکامِ الٰہی کو نظر انداز کر کے کچھ دوسرے اصول اپنانے کی کوشش کی ہے۔

اسلام کے ساتھ ہمیں زبان کی حد تک تعلق ضرور ہے لیکن اس کے اختیار کرنے کے بعد فکر و نگاہ کے جن زاویوں، عمل کے جن میدانوں اور خوب و ناخوب کے جن پیمانوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے اُس کے لیے ہم قطعاً تیار نہیں ہوتے۔ وہ قوم جو دعویٰ تو اللہ کی بندگی کا کرتی ہے لیکن وہ زندگی کے کسی شعبے میں اس بندگی کے بنیادی تقاضوں تک کو پورا کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہوتی۔ وہ اس دین کی برکات سے کس طرح بہرہ مند ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں جو یہ بار بار آتا ہے کہ جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ تو اس کے معنی یہی ہیں کہ راہِ حق پر چلنے میں خواہ تمہیں کتنی دقتیں پیش آئیں، اس میں کتنے ہی موانع حائل ہوں اور اس راہ پر خواہ تمہیں مال و جان کی کتنی ہی قربانی پیش کرنی پڑے تمہیں اس صراطِ مستقیم سے ہٹنا نہ چاہیے۔ باطل نظامِ حیات اور غلط افکار و نظریات کو بیخ و بن سے اکھیڑ کر خدا پرستانہ نظامِ زندگی کی تشکیل اور صحت مند تصورات کی نشو و نما کوئی بچوں کا کھیل

نہیں جسے محض خوشی خوشی کھیل لیا جائے ۔اس کے لیے اللہ اور اس کے رسول پر غیر متزلزل یقین اسلام کے صحیح اور برحق ہونے پر مکمل اعتماد اور اس کی دنیوی اور اخروی برکات اور واحد ذریعۂ نجات ہونے پر مکمل بھروسہ ضروری ہے پھر اس کے مطابق سب سے پہلے اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے کا عزم صمیم اور بالآخر پوری دنیا پر اس کے غالب کرنے کا عزم اور اس راہ میں جو دشواریاں پیش آئیں ، انہیں برداشت کرنے کی ہمت اور جو قربانیاں دینی پڑیں اُن کے لیے رضامندی ایمان کے بنیادی تقاضے ہیں ۔جب تک ہم ان ساری منازل کو طے کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے ہم کبھی بھی دنیا میں عزت و آبرو کا کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتے ۔ دنیا میں بے یقینی سے زیادہ کوئی بڑا گناہ نہیں اور نفاق سے زیادہ کوئی مہلک مرض نہیں۔ ان دونوں سے ہمیں نجات حاصل کرنی چاہیے ۔

(بقیہ رسائل و مسائل) پہننا شروع کردی تھیں لیکن آپ نے جب اسے اتار دیا تو صحابہ نے بھی سونے کی انگوٹھیاں اُتار دیں مُسند احمد میں ایسی متعدد روایات ہیں جن میں سے ایک یہ ہے : اتخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتما من ذھب . . . فاتخذ الناس خواتیم الذھب فقال انی کنت البس ھذا الخاتم وانی لن البسہ ابداً فنبذہ فنبذ الناس خواتیمھم

جہاں تک لوہے کی انگوٹھی کا تعلق ہے، اس کے استعمال کا صریح جواز بعض دوسری احادیث سے بھی نکلتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتم مبارک کے متعلق ابوداؤد، باب خاتم الحدید میں یہ الفاظ موجود ہیں: کان خاتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم من حدید ملوی علیہ فضۃ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی لوہے کی تھی جس پر چاندی چڑھائی گئی تھی) ۔ یہ حدیث سنن نسائی میں بھی ہے ۔اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر و لحاظ ہے کہ موجودہ زمانے میں فولاد STAINLESS STEEL جس سے بالعموم انگوٹھیاں بنائی جاتی ہیں یہ متعدد آمیز شوں سے تیار کیا جاتا ہے اس لیے مجرد لوہے کی انگوٹھی کو اگر مکروہ قرار دیا بھی جائے تب بھی جو انگوٹھیاں سونے کے ماسوا لوہے اور دوسرے مرکبات سے تیار کی جاتی ہیں، ان کے استعمال کی ممانعت کسی مضبوط دلیل پر مبنی نظر نہیں آتی ۔ (غ ۔ ع)